جیون دھارا

ناول

ڈاکٹر طہٰ حسین

مترجم: رضی عابدی

(ناول)

جیون دھارا

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجم: رضی عابدی

مشعل

آر-بی5' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600' پاکستان

MashalBooks.org

فہرست

دیباچہ
آخری مرد کی موت

افسانے

ایک سابق وزیر کی موت
جنت میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں
بند کمرے میں
مرد
وہ خچر نہیں تھا
سب سے بڑا جرم
اسے کسی نے بتایا ہی نہیں
''بیوٹی فل''
ایک آرٹسٹ دوست کے نام ذاتی خط
دو سہیلیاں
تصویر
مضمون

MashalBooks.org

تعارف

طٰہٰ حسین کی سوانح عمری عربی ادب کے شہ پاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ سوانح عمری ایک ناول کی شکل میں لکھی گئی ہے اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ ناول نہ صرف ایک غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل شخصیت کی بتدریج نشو ونما کا ریکارڈ ہے بلکہ اس میں موجودہ صدی کے دور کے مصر میں طالب علموں کی زندگی کی ایک دل پذیر تصویر بھی ملتی ہے۔

مصنف نے اپنی زندگی کے شروع کے سال شمالی مصر کے اسی گاؤں میں گزارے جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنی سوانح کے پہلے حصے میں اپنی زندگی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نہایت دل سوز ہے، کیونکہ طٰہٰ حسین بچپن سے ہی نابینا تھا۔ ناول میں ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح اور کس دشواری سے وہ اپنے گردونواح کا شعور حاصل کرتا ہے اور کس طرح اس کے تخیل کی غیر معمولی نشو ونما اس کمی کو پورا کر دیتی ہے جو اسے نابینا ہونے کے باعث سہنا پڑی تھی۔ وہ سکول جاتا ہے اور عام لڑکوں کی طرح کھیل اور کام، کامیابی اور توہین کے تجربوں سے گزرتا ہے۔ وہ نہایت ہی کم عمر میں قرآن حفظ کر لیتا ہے۔ اس کی تمنائیں بر آتی ہیں اور تیرہ سال کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ قاہرہ روانہ کر دیا جاتا ہے۔ جہاں اسے الاظہر یونیورسٹی میں داخلہ مل جاتا ہے۔ سوانح عمری کی پہلی جلد یہاں ختم ہو جاتی ہے اور دوسری جو آپ کے ہاتھوں میں ہے شروع ہوتی ہے۔

اس زمانے میں الاظہر یونیورسٹی اپنی تاریخ کے ایک بحرانی دور سے گزر رہی تھی۔ یہ 970ء میں بنی تھی اور اس نے پہلے دور میں ہی اسلامی سٹڈیز کے سکول کی حیثیت

سے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی ۔ مشرق میں منگولوں کے حملے کے بعد اور مغرب میں اسلام کے زوال کے بعد عالم اسلام میں کوئی ادارہ نہیں تھا جو اس کی برابری کر سکے لیکن ترکی اور مملوکی حکومتوں کے دوران یعنی سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک جب اسلامی علوم کا عام طور پر انحطاط ہوا تو اظہر بھی اس سے نہیں بچ سکا اور یہاں ''علم'' فرسودہ اور گھسٹی پٹی تعلیمات کو دھرانے کا نام بن کر رہ گئی ۔ روایتی سائنس جن کی بنیاد الہاموں پر تھی اور اس لئے ان پر کوئی تنقید نہیں کی جا سکتی تھی ۔ وہ اظہری تعلیم میں مضبوطی سے جڑ پکڑ گئیں ۔ ان ''سائنسوں'' میں خاص طور پر چار تھیں ۔ (1) حدیث ۔ یہ علم کا وہ ذخیرہ ہے جو پیغمبر محمد ﷺ اور ان کی تعلیمات کے متعلق قرآن کے بعد ہمارا سب سے اہم ذریعہ ہے ۔ حدیث کی تعلیم میں نہ صرف اصل عبارت کی چھان بین کرنا ہوتی ہے بلکہ ان مشتبہ تحریروں کی بھی جن کے توسط سے ہر حدیث ہم تک پہنچی ۔ (2) ۔تفسیر ۔یعنی قرآن کی ترجمانی ۔ (3) اولین اصول ۔یعنی قانون کے بنیادی اصول جو قانون کے چار سکولوں یا کٹر اسلام میں عبادت کے رسوم کے مابینہ مفاہمت کی بنیاد ہیں ۔(4) توحید ۔یعنی خدا کی وحدت کا فلسفہ ۔

''روایتی'' سائنسوں کے بعد نام نہاد ''عقلی'' سائنس آتی تھیں ، جن میں صرف ونحو ، علم عروض ، صنعت کلام اور منطق شامل تھے ۔علم نجوم محض عملی مقاصد کیلئے پڑھایا جاتا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں کسی قسم کی تخیلی آزادی کی گنجائش نہیں تھی ۔ دوسری طبیعاتی سائنس اور علم ریاضی جن میں ایک زمانے میں اسلام نے دنیا کی رہنمائی کی تھی ان کا بھی وہی حشر ہوا جو تاریخ ، جغرافیہ اور ادب کا ہوا اور وہ تقریباً غفلت کا شکار ہو گئیں ۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے بعد مغربی تہذیب کا مصر پر کسی نہ کسی طرح اثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور الاظہر بھی اس سے گہرے طور پر متاثر ہوا ۔ محمد علی اور اسماعیل پاشا دونوں نے اصلاحات کی کوششیں کیں لیکن ان کوششوں کو شیخوں کی اکثریت کی طرف سے زبردست رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا اور اس لئے وہ صرف محدود طور پر ہی کامیاب ہو سکیں ۔

لیکن انیسویں صدی کے آخری تیس سالوں میں مصر میں دو عظیم انسان ابھرے جنہوں نے مصری معاشرے کی زندگی اور سوچ پر دیرپا اثر ڈالا ۔ السید جمال الدین افغانی قاہرہ میں 1871ء میں پہنچے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مصر برطانوی اور فرانسیسی بنکوں کا زبردست طور پر مقروض ہونے کے باعث نہ صرف دیوالیہ ہوتا جا رہا تھا بلکہ اسکی خودمختاری

MashalBooks.org

کو بھی خطرہ تھا۔ جمال الدین کو پہلے ہی افغانستان، فارس، ہندوستان اور ترکی میں مسلم قوموں کی آزادی کے لئے جدوجہدیں کر چکا تھا، وہ اب مصری نوجوانوں کی تحریک کا دانشور رہنما بن گیا۔ گیارہ سال بعد، جب خود جمال الدین مصر سے جا چکا تھا، اسی مصری نوجوانوں کی تحریک نے عربی پاشا کی فوجی لیڈرشپ میں برطانوی قبضے کے خلاف ایک ناکام جدوجہد کی۔

جمال الدین مصر میں آٹھ سال رہا۔ اس دوران اسلام سائنسوں پر اپنی مہارت کی بنا پر اوران سائنسوں کے مطالعے سے اس نے جدید عہد کے لئے جو نتائج اخذ کئے ان کی بنا پر اس نے اصلاح کی ایک بڑی تحریک شروع کی جو مصری زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوئی اور اس نے سماجی، سیاسی اور مذہبی غرض ہر پہلو کو اپنے دائرے میں لے لیا۔ 1879ء میں جب جمال الدین کو مصر سے ملک بدر کر دیا گیا تو اس تحریک کی لیڈرشپ اس کے دوست اور شاگرد محمد عبدو نے لے لی۔

جمال الدین کی شخصیت میں ایک بے قرار انقلابی کی روح تھی، جبکہ عبدو ایک باصبر لیکن تندہی سے کام کرنیوالا مصلح تھا۔ جمال الدین مصر میں آٹھ سال سے زیادہ نہیں رہا، جبکہ عبدو، جو ایک کسان کا بیٹا تھا، اس نے اپنی ساری زندگی اپنے آبائی وطن میں ہی گزاری۔ جمال الدین نے تو صرف اظہر کے دانشوروں کے ایک چھوٹے سے گروپ کو ہی متاثر کیا تھا گو مغرب زدہ افندیوں میں اس کے خیالات کو ایک زرخیز زمین ملی تھی۔ اس کے برخلاف حالانکہ عبدو مذہبی معاملات سے زیادہ سیکولر معاملات میں زیادہ با اثر تھا لیکن اس نے الاظہر میں اصلاحات کی سالہا سال کوشش کی کیونکہ اس کے خیال میں عام اسلام میں مذہبی اور سماجی اصلاح کی شروعات کیلئے اظہر کی بے حد اہمیت تھی۔

جمال الدین کے 1879ء میں مصر سے اخراج کے وقت عبدو کی عمر تیس سال تھی لیکن اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا پہلے ہی اظہار ہو چکا تھا۔ شروع کے سالوں میں روایتی اسلامی سٹڈیز کے بنجر پن سے روگردانی کر کے تصوف کی طرف مائل ہو گیا تھا لیکن جمال الدین اسے دوبارہ حقیقی دنیا کی طرف کھینچ کر لایا، اس نے اسے مغربی خیالات سے روشناس کرایا اور اس کو مصر اور اسلام کے عصری مسائل سے دلچسپی دلائی۔ دراصل عبدو جمال الدین کا سب سے نمایاں شاگرد تھا اور اسی لئے اسے دارالعلوم سے ہٹا دیا گیا۔ یہ

اس وقت ہوا جب اس کے استاد کو ملک بدر کر دیا گیا تھا لیکن دوسرے سال ہی ایک نسبتاً زیادہ لبرل وزارت آئی تو اس نے عبدو کو سرکاری سرالے والوقائع المصریہ کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ عبدو نے اس رسالے کو اپنے پروگرام کا پھیلانے کا ذریعہ بنایا۔ اس پروگرام کا مقصد مسلم اقوام کی آزادی اور اسلام کی بتدریج اصلاح اور اس کا اخلاقی اور مذہبی تعلیم کے ذریعہ اندرونی طور پر احیاء تھا۔ اس کی بتدریجیت کے باعث عربی پاشا کی سرکردگی میں قوم پرست اور فوجی ذہنیت رکھنے والے عناصر کے ساتھ اس کی دوستی متزلزل رہی، حالانکہ اس نے ان کی اپنی بساط کے مطابق حمایت کی اور 1882 کی ناکام بغاوت کے بعد ان کے لیڈروں کے ساتھ جلاوطنی کی صعوبتیں بھی سہیں۔

1881ء میں عبدو کو جلاوطنی سے واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد کے سترہ سالوں میں اس نے اپنی زندگی انتھک اور گوناگوں سرگرمیوں میں بسر کی۔ واپس آنے پر اس کو دیسی عدالتوں میں جج کے عہدہ پر فائز کیا گیا اور 1889 میں وہ مصر کا مفتی اعظم بنا دیا گیا۔ اس حیثیت میں اسے ملک میں اسلام کے Cannon law کی ترجمانی کرنے والوں میں اسے سب سے اونچا درجہ حاصل ہو گیا جس کو استعمال کر کے اس نے اسلامی قوانین میں اصلاح کرنے کا کام کیا۔ اس نے روایت کی بے سوچے سمجھے تقلید کرنے کی بجائے اس کی لبرل نقطہ نظر سے ترجمانی کی۔ اسی سال اسکو لجیسلیٹیو کونسل کا ممبر بنا دیا گیا۔ اس نے اس ادارے کو موثر بنانے کے لئے بھی بہت محنت کی کیونکہ اس کے خیال میں یورپی کنٹرول اور مشرقی ملوکیت دونوں سے چھٹکارا پانے اور آزادی اور جمہوری حکومت کے قیام کی طرف یہ ایک اہم پہلا قدم تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ عربی زبان کی اصطلاح کے لئے بھی کافی کام کر رہا تھا، جس کو وہ اسلامی احیاء کے لئے لازمی سمجھتا تھا۔

لیکن ہمارے لئے عبدو کی اہمیت ایک تعلیمی مصلح کی حیثیت سے سب سے زیادہ ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح اظہر کی مردہ روایت پرستی کو توڑ کر اس میں اسلام کے آغاز والی سادگی اور مستعدی کی روح پھونکی جائے اور اس کے ساتھ مغربی سائنس میں جو کچھ بھی سب سے عمدہ تھا اس کو شامل کیا جائے۔ اس کے ذہن میں مذہب اور سائنس میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

آخر کار 1894ء میں اس کی کوششیں بظاہر بار آور ثابت ہوتی نظر آئیں اور

الاظہر کی اصلاح کے لئے اسکی رہنمائی میں ایک انتظامی کونسل کی تشکیل کی گئی لیکن قدامت پسندوں کی مخالفت جو عرصے سے زور پکڑ رہی تھی اب اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی اور محمد عبدہ کے خلاف ایک تحریک چلائی گئی۔ نتیجہ کے طور پر اسے انتظامی کونسل سے دستبردار ہونا پڑا جس کے چند ماہ بعد وہ فوت ہوگیا۔

بہرحال عبدہ کے بعد اس کے خیالات سے متاثر ہونے والوں نے اس کے کام کو جاری رکھا۔ ان میں سعد زاغلول (جس نے18-1914) کی جنگ کے بعد مصر کی آزادی کی تحریک کی رہنمائی کی)، قاسم امین (جو عورتوں کی آزادی کا علمبردار تھا) اور لطفی السید جو ایک لبرل صحافی اور سکالر تھا، ان کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ طٰہٰ کے ناول میں بھی ان کا ذکر ہے۔ ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ الاظہر کی اصلاح کی کوشش کرنا فضول ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے ایک علیحدہ سیکولر یونیورسٹی بنانے کی کوشش کی، جو مصر کی یونیورسٹی کے نام سے1908ء میں قائم ہوئی۔

طٰہٰ حسین کا ناول جن سالوں کا احاطہ کرتا ہے وہ 1902 اور1910 کے درمیان کے یہ زبردست اہمیت رکھنے والے سال ہی ہیں۔ طٰہٰ اظہر میں اس وقت پہنچا جب کہ محمد عبدہ (جس کو ناول میں ''امام'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے) وہاں پڑھا رہا تھا۔ طٰہٰ امام سے ذاتی طور پر کبھی نہیں ملا لیکن اس کی کتاب شروع سے آخر تک ہمیں عبدہ کی زبردست اہمیت، عزت اور اثر کا احساس ملتا ہے۔ طٰہٰ کی الاظہر سے مایوسی نے اسے پہلے تو مرصفی جیسے لبرل شیخوں کی طرف مائل کیا، پھر اظہر کے باہر ان ''طربوش پوشوں'' کی طرف جن میں اسے امام کے حقیقی پیرو ملے۔

مصر کی ثقافت میں جدید تحریک کا خلاصہ ذکر کرنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس ناول کے آخری ابواب کی وسیع تر اہمیت کو سمجھا جا سکے۔ جیسا کہ ایک ریویو کرنے والے نے کہا ان ابواب میں پندرہویں صدی کی یورپی یونیورسٹیوں میں ہیومنزم اور مذہبی روایت پرستی کے درمیان ہونے والے ٹکراؤ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

بہرحال اس ناول کی عظمت صرف سماجی یا تاریخی اعتبار سے ہی نہیں ہے بلکہ بچپن اور نوجوانی کی ایسی (تحریری) تصویروں کے باعث ہے جو بیک وقت مصری بھی ہیں اور آفاقی بھی۔ جیسے جیسے طٰہٰ حسین کی زندگی کا دھارا بہتا جاتا ہے ہم اس میں خود اپنی زندگی

کا عکس دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انسانی فطرت کو گہرے طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں جو ہمارے شعور میں بھی اضافہ کرتی ہے لیکن اداس کیے بغیر بھی نہیں رہتی۔

ہلری ویمنٹ (کچھ ترامیم کے ساتھ)

MashalBooks.org

ا

ابتدائی دو تین ہفتوں میں وہ قاہرہ میں جیسے کھو سا گیا تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ دیہات کو چھوڑ کر دارالحکومت میں آ گیا تھا اور الاظہر میں باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ حواس کے بجائے صرف تخیل کے زور پر دن کے تین بدلتے ہوئے پہروں میں فرق کر سکتا تھا۔

وہ گھر جہاں وہ رہتا تھا اور اس کی طرف جانے والا راستہ دونوں اس کے لئے غیر مانوس اور اجنبی تھے۔ جب وہ الاظہر سے واپس آتا تو دائیں جانب ایک دروازے میں سے ہو کر گزرتا جو دن میں کھلا رہتا اور رات کو بند ہو جاتا۔ مغرب کے بعد اس کے دروازے میں ایک چھوٹا سا راستہ کھلا رہتا۔ اس میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے دائیں رخسار پر ہلکی سی گرمی محسوس ہوتی اور لطیف سا دھواں اس کی ناک کو گدگداتا جبکہ بائیں طرف سے اسے قلقل کی سی آواز آتی جس سے وہ حیران بھی ہوتا اور جو اسے اچھی بھی لگتی تھی۔

کئی روز تک صبح شام وہ اس آواز کو بڑے تجسس سے سنتا لیکن اس میں ہمت نہیں تھی کہ پوچھ سکے کہ یہ کیا ہے۔ پھر ایک دن اسے کسی کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ یہ آواز ایک قسم کے حقے سے آتی ہے جو اس علاقہ کے تاجر پیتے ہیں۔ قہوہ خانہ کا مالک انہیں یہ مہیا کرتا تھا اور اسی میں سے وہ ہلکی سی حرارت اور لطیف سا دھواں اٹھتا تھا۔

وہ کچھ قدم بالکل سیدھا چلتا رہتا۔ یہاں تک کہ وہ ایک سیلی سی، ڈھلوان سی جگہ پر پہنچ جاتا جہاں قہوہ خانہ کے کیچڑ کے جمع ہونے کی وجہ سے قدم جمانا مشکل تھا۔ پھر وہ ایک کھلے راستہ پر نکل آتا لیکن یہ بہت تنگ اور گندہ تھا اور اس میں سے عجیب قسم کی بدبوئیں اٹھتی رہتیں۔ جو صبح سویرے تو اتنی متعفن نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی شام ڈھلے۔ لیکن جوں جوں دن چڑھتا جاتا اور سورج کی گرمی تیز ہو جاتی تو یہ ناقابل برداشت ہو جاتیں۔

وہ اس تنگ راستے سے سیدھا گزر جاتا لیکن بہت کم ایسا ہوا کہ اسے یہ راستہ ہموار اور آسان لگا ہو۔ اکثر اس کا دوست اسے ادھر ادھر دھکیلتا رہتا تا کہ اسے کوئی ٹھوکر وغیرہ نہ لگے۔ پھر وہ نئے رخ پر چل پڑتا اور دائیں یا بائیں ایک مکان کی طرف راستہ ٹٹولتا ہوا رکاوٹوں سے نکل جاتا اور پھر اس پرانی سمت مڑ جاتا۔ وہ بڑی تیزی سے گھبراہٹ کے عالم میں اپنے دوست کے ساتھ ساتھ غلیظ بوؤں کو سونگھتا ہوا چلتا رہتا۔ ہر طرف سے آنے والی بے ہنگم آوازیں اس کے کانوں کے پردے پھاڑ دیتیں اور نیچے دائیں بائیں سے آتی ہوئی یہ آوازیں جیسے اس کے سر کے اوپر ہوا میں اکٹھی ہو جاتیں اور تہہ در تہہ ایک لطیف دھند کی سی شکل اختیار کر لیتیں۔

دراصل ان آوازوں میں بڑا تنوع تھا۔ جھگڑتی ہوئی عورتوں کی بلند ہوتی ہوئی آوازیں غصہ میں بھری ہوئی یا آرام سے گفتگو کرتی ہوئی مردوں کی آوازیں، سامان اتارنے اور چڑھانے کی آوازیں، سقے کی بولیاں، گدھے گھوڑے یا خچر کو گالیاں دیتے ہوئے ریڑھے والے اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور کبھی کبھی آوازوں کا یہ ہنگامہ کسی گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچوں یا کسی گھوڑے کی ہنہناہٹ سے ٹوٹ جاتا۔

جب وہ اس شور وغل سے گزرتا تو اسکے خیالات دور کہیں اور ہوتے اور نہ ہی اسے اپنے وجود کا احساس ہوتا نہ ہی اپنی حرکتوں کا دھیان۔ لیکن سڑک پر ایک خاص جگہ پہنچ کر اسے اپنے بائیں جانب ایک آدھ کھلے دروازے میں سے بات چیت کی بے ہنگم سی آوازیں آتیں۔ پھر وہ جان جاتا کہ ایک دو قدم آگے جا کر اسے بائیں طرف ایک زینہ پر چڑھنا ہے جو اس کے گھر تک جاتا ہے۔

یہ ایک معمولی سا زینہ تھا۔ نہ چوڑا نہ تنگ۔ سیڑھیاں پتھر کی تھیں لیکن چونکہ یہ کثرت سے استعمال ہوتا اترنے کے لئے بھی چڑھنے کے لئے بھی اور کوئی اسے دھونے یا صاف کرنے کی تکلیف نہیں کرتا تھا۔ اس لئے اس پر گندگی کی موٹی تہہ جم جاتی اور سیڑھیوں پر سخت پتھر کی طرح جمع ہو جاتی۔ یوں سیڑھیوں کے پتھر پوری طرح ڈھک جاتے اور چاہے آپ نیچے جائیں یا اوپر یہ زینہ مٹی کا بنا ہوا لگتا تھا۔

جب بھی لڑکا زینہ اترتا یا چڑھتا تو وہ اپنے قدم گنتا رہتا لیکن برسوں اس جگہ رہنے کے باوجود اور زینہ کے ان گنت چکر لگانے کے باوجود کبھی اس کے ذہن میں یہ نہ آیا

کہ سیڑھیوں کو گنے۔ دوسری یا تیسری بار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے معلوم ہوا کہ کچھ قدم چلنے کے بعد اسے تھوڑا سا بائیں طرف مڑنا ہوتا تھا اور پھر باقی سیڑھیاں چڑھنی ہوتی تھیں۔ درمیان میں ایک راستہ دائیں طرف آتا مگر وہ اس میں کبھی نہیں گیا۔ گو اسے معلوم تھا کہ یہ اس عمارت کی پہلی منزل کو جاتا تھا جس میں وہ اتنے برسوں سے رہ رہا تھا۔

اس منزل پر طلباء نہیں رہتے تھے بلکہ یہاں مزدوروں اور تاجروں کا ڈیرہ تھا۔ دائیں طرف کے دروازہ کو چھوڑ کر وہ دوسری منزل پر چڑھ جاتا۔ یہاں اس کی پریشان روح کو آرام اور سکون ملتا۔ تازہ ہوا کے جھونکے پھیپھڑوں سے اس حبس کو نکال دیتے جس سے اس گندے زینہ پر اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ پھر وہاں طوطا بھی تھا جو بے تکان سیٹیاں بجاتا رہتا گویا ساری دنیا کے سامنے اپنے ایرانی مالک کے ظلم کا اعلان کر رہا ہو جس نے اسے ایک گندے سے پنجرے میں بند کیا ہوا تھا اور جو اسے کل نہیں تو پرسوں کسی ایسے آدمی کے ہاتھوں فروخت کرنے والا تھا جو اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتا اور جب وہ اس سے چھٹکارا پا کر رقم مٹھی میں لے لیتا تو پھر ایسے ہی ایک اور طوطے کو پکڑ کر وہ اس غلیظ پنجرے میں ڈال دیتا جو اس طرح اپنے مالک کے خلاف شور کرتا اور اپنے فروخت ہونے کا انتظار کرتا رہتا۔ اس ہاتھ سے اس ہاتھ، اس پنجرے سے اس پنجرے، جہاں بھی وہ جاتا اس کے نالے مردوں اور عورتوں کے دلوں کو خوش کرتے۔

ہمارا دوست جب زینے کے سرے پر پہنچا تو اس نے اپنے چہرے کو چھوتی ہوئی تازہ ہوا کو اندر کھینچا اور طوطے کی آواز سنی جو اسے دائیں طرف بلا رہی تھی۔ اس نے لبیک کہا اور ایک تنگ برآمدے میں سے ہو کر ان دو کمروں کے آگے سے گزرا جن میں دو ایرانی رہتے تھے۔ ان میں سے ایک ابھی جوان تھا جبکہ دوسرا ادھیڑ عمر کو پہنچ چکا تھا۔ ایک اتنا ہی اداس اور آدم بیزار تھا جتنا دوسرا شوخ اور خوش طبع۔

آخر لڑکا گھر پہنچ گیا۔ ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوا جس میں کچھ گھریلو ضروریات مہیا تھیں۔ اس کے آگے ایک اور کمرہ تھا۔ کشادہ لیکن بے ہنگم جو بجلی اور علمی مقاصد کے لئے کام آتا تھا۔ یہ خواب گاہ، طعام گاہ، مطالعہ کا کمرہ اور بیٹھک سب کچھ تھا۔ یہاں کتابیں تھیں، برتن تھے اور کھانے کی چیزیں تھیں اور یہاں اس کا اپنا ایک مخصوص گوشہ بھی تھا جیسا کہ ہر اس کمرہ میں ہوتا ہے جہاں وہ رہتا یا اکثر جایا کرتا۔

MashalBooks.org

یہ مخصوص گوشہ دروازے کے پیچھے بائیں طرف تھا۔ ایک دو قدم آگے زمین پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی اور اس پر ایک پرانا قابل استعمال قالین تھا دن میں وہی ہاں بیٹھتا اور رات کو یہاں سوتا۔ ایک تکیہ اس کے سر کے نیچے ہوتا اور اوڑھنے کے لئے ایک کمبل۔ کمرے کے دوسری طرف بڑے بھائی کا علاقہ تھا جو اسکی جگہ سے کسی قدر بلند تھا اس نے بھی نیچے چٹائی بچھائی ہوئی تھی جس پر ایک عمدہ قالین تھا۔ پھر ایک گدہ اور اس کے اوپر بڑا سا کشادہ بستر جس میں روئی بھری تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ اس پر ایک غلاف بھی تھا۔ یہاں نوجوان شیخ اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ بیٹھتا۔ انہیں دیوار کے ساتھ کمر نہیں لگانی پڑتی تھی، جیسا کہ لڑکا بیٹھتا تھا بلکہ یہاں قالین پر اوپر نیچے تکیے لگے ہوئے تھے۔ رات کے وقت یہ گدہ بستر بن جاتا تھا جس پر شیخ سوتا تھا۔

MashalBooks.org

۲

لڑکے کو اپنے گردوپیش کا بس اتنا ہی اندازہ تھا۔ اس کی زندگی کے دوسرے دور کا تعلق گھر اور الاظہر کے درمیان اس کے ہنگامہ خیز سفر تھے۔ وہ چھتے سے باہر نکلتا۔ قہوہ خانہ کی گرمی اس کے بائیں رخسار پر محسوس ہوتی اور دائیں طرف سے اسے حقہ کی گڑگڑ کی آواز سنائی دیتی۔ سامنے ایک دوکان تھی جس کا اس کی زندگی میں اہم حصہ تھا۔ یہ الحاج فیروز کی دوکان تھی جو آس پاس کے علاقوں میں اکثر ضروریات زندگی کی سپلائی کرتا تھا۔ صبح کے وقت وہ ابلے ہوئے لوبیے کی پھلیاں بیچتا تھا۔ جو مختلف روائتی طریقوں سے تیار کی جاتی تھیں لیکن الحاج فیروز ان کے خواص کا بڑے فخر سے ذکر کرتا اور اسی حساب سے ان کی قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ اس کے پاس سادہ چربی میں بنا ہوا، مکھن میں تلا ہوا اور طرح طرح کے تیل میں تیار کیا ہوا لوبیا ہوتا اور فرمائش کے مطابق وہ ان میں ہر طرح کے مصالحہ بھی ملا دیتا تھا۔ جہاں تک طالب علموں کا تعلق تھا انہیں لوبیا بہت پسند تھا اور اکثر وہ بہت سا کھا جاتے تھے جس کی وجہ سے دوپہر تک ان کا سر بھاری رہتا اور دوپہر کے لیکچر کے وقت وہ سو جاتے۔

شام ہوتی تو الحاج فیروز اپنے گاہکوں کو کھانا فروخت کرتا، جس میں پنیر، زیتون، پسے ہوئے سیم کے بیج یا شہد شامل ہوتے۔ زیادہ شوقین لوگوں کو وہ مچھلیوں کے ڈبے بھی مہیا کرتا اور غالباً چند کو دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وہ ایسی چیزیں بھی بیچتا جس کا کوئی نام نہیں تھا اور جن کا کھانے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ چیزیں جن کا بہت چپکے چپکے نام لیا جاتا ہے اور جنہیں بڑی شدت سے چاہا جاتا ہے۔

MashalBooks.org

یہ دھیمی باتیں لڑکے کے کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی اسے کچھ کچھ سمجھ بھی آتا لیکن عموماً یہ سارا کاروبار اس کیلئے ایک راز تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور وہ بڑا ہوتا گیا تو اسے ان اشاروں کا مطلب سمجھ میں آنے لگا اور یہ مخمصے اس پر کھلنے لگے۔ اسے اب جو کچھ معلوم ہوا اس سے اچھائی اور برائی کے اس کے معیار متاثر ہوئے اور لوگوں اور چیزوں کے متعلق اس کے اندازے بدل گئے۔

الحاج فیروز ایک لمبا تڑنگا کالا بھجنگ آدمی تھا اور کسی حد تک کم گو تھا لیکن جب وہ بولتا تھا تو لفظ صاف نہیں ہوتے تھے اور وہ غربی کو اس طرح تتلا کے بولتا تھا کہ آج تک لڑکے کے ذہن پر اس کی گفتگو کا نقش باقی ہے۔ وہ ہمیشہ اسے البیان والتبین میں زیاد اور اس کے شاگرد کی کہانی یاد دلاتا تھا۔ زیاد نے اپنے شاگرد سے کہا کہ وہ یہ فقرہ بولے۔ ''ہمیں ایک خچر دیا گیا۔'' لڑکے نے یہ فقرہ یوں دہرایا۔ ''ہمیں ایک چچر دیا گیا۔'' ''بدبخت'' زیاد نے غصہ سے کہا۔ ''اگر تو خچر نہیں کہہ سکتا تو اس کی جگہ گھوڑا کہہ لے۔'' اس پر لڑکے نے جواب دیا ''ہمیں ایک گورا دیا گیا'' زیادہ سخت جز بز ہوا اور اس نے چچر کو ہی غنیمت جانا۔

الحاج فیروز کو اس علاقہ میں اور خصوصاً طالب علموں کے درمیان ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔ جب مہینے کے آخر میں ان کے پاس پیسے ختم ہو جاتے تو وہ اسی کے پاس بھاگے بھاگے آتے یا پھر اس وقت آتے جب ان کے پیسے آنے میں دیر ہو جاتی۔ وہی انہیں کھانا ادھار دیتا۔ کبھی کبھی ایک دو روپے بھی قرض دے دیتا اور ہر قسم کی مشکل میں ان کی مدد کرتا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ اکثر وہ اسی طرح ان کا ذکر کرتے تھے۔ جیسے الاظہر کے جید شیوخ کا۔

صرف اتنا ہی نہیں تھا ایک اور طرح بھی الحاج فیروز طالب علموں کیلئے بہت اہم تھا۔ اسی کے پتہ پر ان کے گھروں سے خط آتے اور تڑے مڑے نوٹ آتے جنہیں لے کر وہ ڈاک خانہ جاتے اور وہاں سے چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی جیبیں لے کر لوٹتے جس کی جھنکار سے ان کے کان اور دل جھوم اٹھتے۔

قدرتی بات تھی کہ کوئی بھی طالب علم الحاج فیروز کی دوکان پر صبح یا شام دن کا کوئی بھی وقت گزارنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ یا پھر کم از کم اس جگہ پر ایک اچٹتی

سی نگاہ ضرور ڈالتا جہاں گھروں سے آئے ہوئے خطوں کا ڈھیر لگا ہوتا۔ کتنی بار کوئی بند لفافہ لے کر گھر کو جاتا جس پر تیل اور مکھن کے دھبے لگے ہوتے لیکن اس چکناہٹ کے باوجود اس خط کی اس کی نظر میں بہت اہمیت ہوتی۔ کسی کاپی یا قانون، گرامر اور دینیات کی کتاب سے بھی زیادہ۔

چنانچہ چھتہ سے گزرنے کے بعد لڑکا خود کو الحاج فیروز کی دوکان کی سامنے پاتا۔ اس کا دوست اسے چند قدم الحاج فیروز کی دوکان کی طرف لے جاتا اور وہ پوچھتا کہ اس کیلئے کوئی خط وغیرہ آتا ہے۔ جواب سن کر یا تو وہ مسکرادیتا اس کے چہرے پر مایوسی پھیل جاتی۔ پھر وہ بائیں جانب مڑتا اور راہگیروں سے بھری ہوئی لمبی تنگ گلی میں آگے کی طرف چل پڑتا۔ یہاں طالب علموں، تاجروں، دوکانداروں اور مزدوروں کی بھیڑ رہتی۔ گدھے گاڑیاں۔ گھوڑے گاڑیاں اور بیل گاڑیاں ہوتیں۔ گاڑی بان شور مچا مچا کر لوگوں کو ہٹاتے اور ان مردوں عورتوں اور بچوں کو گالیاں دیتے جو ان کے راستہ میں آجاتے۔ پھر گلی کے دونوں طرف مختلف قسم کی دوکانیں تھیں جن میں سے زیادہ تر غریب لوگوں کیلئے کھانے کی دوکانیں ہوتیں۔ ان میں سے اٹھتی ہوئی بوئیں بہت مکروہ ہوتیں۔ اس کے باوجود بہت سے راہگیر ان کی طرف رغبت سے کھنچتے۔ ان میں طالب علم بھی ہوتے۔ مزدور بھی اور قلی بھی۔ ان میں کچھ ان دکانوں کا رخ کرتے اور کھانے کی کوئی چیز خریدتے اور وہیں اسے کھا لیتے یا گھر لے جا کر کھاتے۔ اکیلے یا دوسروں کے ساتھ اور کچھ ان خوشبوؤں سے متاثر ہونے کے باوجود قطعی ادھر توجہ نہ دیتے۔ ان کا جی چاہتا مگر ضبط کرتے۔ ان کی آنکھیں دیکھتیں، ان کی ناکیں سونگھتیں اور ان کی بھوک جاگ اٹھتی لیکن افسوس ان کی جیبیں خالی ہوتیں۔ ان کا بہت جی چاہتا لیکن غصہ اور بدمزگی کے ساتھ وہ وہاں سے گزر جاتے۔ پھر بھی وہ اپنی تقدیر پر راضی رہتے اور مجبوراً اسے قبول کر لیتے۔

کچھ دوسری دکانوں میں بڑی خاموشی اور دھیمے پن سے خرید وفروخت جاری رہتی اور بمشکل ہی اس کی آواز سنائی دیتی۔ اس کے باوجود یا شاید اسی وجہ سے اس تجارت میں زبردست منافع تھا۔ بظاہر ان میں سے اکثر دوکانوں پر قہوہ اور صابن کی فروخت ہوتی تھی گو کچھ پر شکر اور چاول بھی مل جاتے تھے۔

جب وہ اس تمام ہنگامے سے گزرتا تو لڑکے کے اندر بھی ایک زبردست

اشتیاق پیدا ہوتا لیکن اگر اس کا دوست کبھی کبھی کچھ وضاحتیں نہ کرتا تو اسے کچھ بھی پتہ نہ چلتا۔ وہ اپنے راستہ پر چلتا۔ کبھی سیدھا بے خطر اور کبھی ایک طرف کو ہو کر۔ سڑک خالی ہوتی تو وہ زیادہ اعتماد سے چلتا لیکن جب گلی میں ہجوم زیادہ ہوتا یا اس میں موڑ بہت ہوتے تو اس کے کنارہ سے ٹکرا جاتا یا اسے ٹھوکر لگ جاتی۔ آخر وہ اس جگہ پہنچ جاتا جہاں سے اسے تھوڑا سا بائیں طرف مڑنا ہوتا اور ایک ایسی گلی میں داخل ہو جاتا جو بے انتہا تنگ۔ ٹیڑھی میڑھی اور گندی تھی۔ یہاں کی فضا گندی تھی اور مکروہ بدبوؤں کا زور تھا اور کبھی کبھی نحیف، بے جان سی آوازیں آتیں جن سے دکھ اور مصیبت کا اظہار ہوتا اور لوگوں کے قدم بہ قدم خیرات مانگنے والوں کی آوازیں آتیں گویا زندگی کو صرف کانوں سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ان کے جواب میں دوسری آوازیں آتیں، باریک، کرخت، گھٹی ہوئی۔ ان پرندوں کی آوازیں جنہیں ظلمتوں، تباہیوں اور بربادیوں نے بگاڑا ہوتا ہے۔ اکثر ان آوازوں کے ساتھ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی جو کبھی کبھی اس کو ڈراتے ہوئے اس کے کان یا چہرے کے پاس سے گزر جاتی۔ فطرتاً اس کا ہاتھ حفاظت کیلئے اٹھتا اور پھر کچھ دیر تک اس کا دل خوف سے دھڑکتا رہتا۔

وہ اپنے دوست کے ساتھ اس تنگ و تاریک اور مڑے تڑے راستہ پر چلتا رہتا جو کبھی اوپر جاتا کبھی نیچے اور کبھی ہموار ہو جاتا۔ کبھی دائیں کبھی بائیں اور تمام وقت یہ مکروہ آوازیں اس پر یلغار کرتی رہتیں۔ کبھی سامنے سے اور کبھی پیچھے سے۔ لیکن کبھی اسے پریشان کئے بغیر نہ گزرتیں۔ کچھ عرصہ بعد وہ اپنے دل میں ایک ہلکا پن محسوس کرتا۔ اس کے پھیپھڑے کشادہ ہو جاتے اور اسے معلوم ہو جاتا کہ اب مصیبت سے چھٹکارا کا وقت آ گیا ہے۔ وہ اطمینان کا سانس لیتا جس میں تشویش اور پریشانی کا بوجھ بھی شامل ہوتا۔

اب وہ کھل کر اور آسانی سے سانس لے رہا تھا۔ گویا وہ تازہ ہوا سے زندگی کے بڑے بڑے گھونٹ لے رہا تھا جو چمگادڑوں کی گلی سے نکلتے ہی اس کے چہرے پر پڑتی تھی۔ وہ سڑک پر آگے بڑھتا رہتا تھا اور سڑک بڑی بیدردی سے اس کے قدموں کے نیچے بل کھاتی اور پھر سیدھی ہو جاتی جس پر وہ آسانی سے اور اعتماد کے ساتھ چل سکتا۔ جب وہ خوشگوار پرسکون گلی سے گزرتا تو اس کا دل آوازوں کے ایک عجیب سے آہنگ سے کھل اٹھتا۔ ایک طرف مسجد سیدنا الحسین ہوتی اور دوسری طرف چھوٹی چھوٹی دو کانوں کا یہ

سلسلہ۔ آنے والے دنوں میں وہ کتنی ہی بار ان میں سے ایک دوکان پر رکتا اور کیسی مزے مزے کی چیزوں کا لطف لیتا۔ گرمیوں کے دنوں میں بھیگی ہوئی کھجوریں اور ان کا شیرا اور سردیوں میں میووں سے بنا ہوا شامی کیک، سبسا۔ جو پورے جسم میں ایک تازگی اور تراوٹ پیدا کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی شامی پرچون فروش کی دوکان پر رکتا اور مختلف قسم کی ٹھنڈی، گرم، نمکین یا میٹھی کھانے کی چیزوں میں سے کچھ کا انتخاب کرتا۔ ان کا ذائقہ اسے بے پناہ لطف دیتا۔ تاہم اگر اب اسے یہ چیزیں پیش کی جاتیں تو اسے بیمار کر دیتیں بلکہ زہر ثابت ہوتیں۔

وہ اس گلی میں چلتا رہتا یہاں تک کہ آوازیں تیز اور تعداد میں زیادہ ہو جاتیں۔ اسے اندازہ ہو جاتا کہ سڑکیں یہاں جدا ہوتی ہیں اور وہ دائیں یا بائیں جا سکتا ہے یا سیدھا یا پھر واپس مڑ سکتا ہے۔ ''یہ چوراہا ہے'' اس کا ساتھی کہتا۔ ''اگر تم دائیں طرف جاؤ تو الجدیدہ۔ پھر مشکی اور پھر عتبہ الخفر اپہنچ جاؤ گے۔ بائیں طرف شارع الدراستہ ہے لیکن سیدھے شارع الحلواجی جاتا ہے۔ جو علم و محنت کی شارع ہے۔ یہ اتنی تنگ ہے کہ اگر تم اپنے بازو پھیلاؤ تو دائیں بائیں دیوار کو چھو سکتے ہیں۔ اب تم کتابوں کی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے درمیان چل رہے تھے جہاں ہر قسم کی کتابیں ہیں۔ نئی اور پرانی، اچھی اور بری، چھپی ہوئی اور مخطوطے۔''

ہمارا دوست کتنی ہی مرتبہ اس تنگ گلی میں رکتا اور مستفیض و محفوظ ہوتا اور جب اس کی زندگی کا راستہ بدل گیا اس وقت بھی یہ نقش اس کے ذہن پر محفوظ رہے۔

لیکن اب اسے تیزی سے گزرنا ہے اس کے معاون ساتھی کو لیکچر شروع ہونے سے پہلے اظہر پہنچنا ہے۔ وہ اب وہاں پہنچ گئے تھے۔ بربر دروازے پر اس نے اپنے جوتے اتارے۔ کچھ آگے جا کر وہ ایک نیچی سی دہلیز سے اتر کر اظہر کے صحن میں پہنچا اور اس نے صبح کی ٹھنڈی تازہ ہوا کو اپنے چہرے پر محسوس کیا اور یوں وہ اپنی زندگی کے تیسرے دور میں داخل ہوا۔

۳

اپنی زندگی کا تیسرا دور اسے سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اپنے کمرہ میں اس نے غریب الوطنی کے سب دکھ جھیلے۔ اسے یہ دیس اجنبی لگتا تھا اور وہ کبھی سوائے چند قریب ترین چیزوں کے اس سے مانوس نہیں ہوا تھا۔ وہ یہاں اس طرح نہیں رہ رہا تھا جیسے وہ اپنے وطن میں رہتا ایسی جگہوں میں جہاں اسے غربت کا احساس نہ ہوتا۔ یہاں اس نے اپنی زندگی کے دن لوگوں اور چیزوں سب سے لاتعلق ہو کر گزارے اور اس میں اتنا کرب تھا کہ گھٹن کی اس فضا میں نہ اسے سکوں تھا نہ لطف بس ایک طرح کا بوجھ تھا، ایک دکھ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اظہر میں قیام کو اس مسلسل تکلیف دہ سفر سے بہتر سمجھتا تھا جس کے خوف سے وہ پریشان ہو جاتا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ اس کے قدم بے تکے اور اکھڑے ہوئے پڑتے تھے بلکہ اس کا دل اس حوصلہ شکن مخمصے کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا جو انسان کے عزائم کو مسخ کر دیتا ہے اور اسے اندھا دھند آگے بڑھتے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ صرف سڑکوں پر ہی نہیں جہاں چلنا ناگزیر ہے بلکہ ذہن کے راستوں پر بھی۔ بلا کسی مقصد اور بے سوچے سمجھے۔ نہ صرف وہ اپنے گرد بپا ہنگامہ سے بدحواس تھا بلکہ اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بھی پریشان تھا اور اسے یہ بھی ناممکن نظر آتا تھا کہ وہ اپنے رفیق کے تیز تیز اور پراعتماد قدموں سے اپنے دھیمے اور بھٹکتے ہوئے قدموں کو ہم آہنگ کر سکے۔

صرف دن کے تیسرے حصہ میں ہی اسے سکون اور تحفظ کا کچھ احساس ہوتا۔ فجر کے وقت اظہر کے صحن سے گزرتے ہوئے بادِ سحر کے جھونکے اسے خوشگوار لگتے۔ اور اس میں تحفظ اور امید کے احساسات پیدا کرتے۔ یہ جھونکے جب اس کی پیشانی کو چھوتے جو سفر کی گرمی کے باعث پسینہ سے شرابور ہوتی تو بالکل ایسے محسوس ہوتے جیسے بچپن میں اس

کی ماں کے بوسے جو اس وقت ملا کرتے تھے، جب وہ قرآن کی تلاوت کرتا یا اسے کوئی دلچسپ کہانی سناتا جو اس نے گاؤں کے سکول میں سنی تھی، یا جب وہ زرد اور نحیف سا دودھ پیتا بچہ، سورہ یٰسین کی تلاوت کے دوران اٹھ کر گھر کے کسی کام کے لئے باہر جاتا تھا۔

وہ بوسے اس کے دل کو ایک تازگی بخشتے اور صرف پیار ہی نہیں بلکہ اسے اعتماد اور امید بھی دیتے۔ بادِ نسیم کے جھونکے جو اظہر کے صحن میں اسے خوش آمدید کہتے وہ بھی تھکاوٹ اور بے چینی کے بعد اسے کچھ کم سکوں اور راحت نہ دیتے اور اترے ہوئے چہرے کو پھر سے کھلا دیتے۔ البتہ اسے ابھی اظہر کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا اور اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کیا ہوگا۔ لیکن اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اس کے ننگے پاؤں میں صحن کی زمین کو چھوئیں۔ بادِ سحر اس کے چومے اور اسے یہ محسوس ہو کہ اس کے ارد گرد اظہر خواب سے بیدار ہونے کی تیاری کر رہا ہے اور جلد ہی اس کی خاموشی حرکت میں بدل جائیگی۔ جیسے جیسے زندگی اس میں پیدا ہوئی اس میں خود آگہی بھی پیدا ہونے لگی۔ اس میں یہ اعتماد پیدا ہوا کہ وہ اپنے ہی وطن میں ہے۔ اپنے ہی لوگوں کے درمیان اور تنہائی اور اسے اداسی کا احساس ختم ہو گیا۔ اس کی روح شگفتہ ہو گئی۔ اس کا رواں رواں شوق جستجو سے تڑپ اٹھا..................... لیکن کیسی جستجو؟ علم.......... اس سے وہ نابلد تھا گو اسے اس سے لگاؤ تھا اس کیلئے کشش تھی۔ اس نے کتنی مرتبہ یہ لفظ سنا تھا اور اس کے راز کو جاننے کی کوشش کی تھی۔ یقیناً اس کے ذہن میں اس کا ایک دھندلا سا تصور تھا لیکن اتنا اسے یقین تھا کہ علم کی کوئی حد نہیں اور لوگ اسکے سمندر سے چند قطرے حاصل کرنے میں زندگیاں صرف کر سکتے ہیں۔ وہ بھی اپنی زندگی اس کیلئے وقف کرنا چاہتا تھا اور جس قدر ممکن ہو اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے والد اور ان سے ملنے کے لئے آنے والے عالم احباب علم کو ایک بحرِ بیکراں کہتے تھے اور بچہ نے کبھی اسے استعارہ یا تشبیہہ نہیں سمجھا تھا۔ اسے یہ ایک سیدھی سادھی حقیقت نظر آتی تھی۔ وہ قاہرہ آیا تھا، اظہر میں آیا تھا کہ وہ اس سمندر میں اتر جائے اور جتنا ہو سکے اس سے سیراب ہو۔ یہاں تک کہ وہ اس میں ڈوب جائے۔ کسی اہل دل کیلئے اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ علم کے سمندر میں غرق ہو جائے۔ کسی نئی دنیا میں یہ جست کتنی خوبصورت ہوگی!

اس کے چھوٹے سے دل میں یہ خیالات امڈ آئے اور اس میں سما گئے۔ اس پر

چھا گئے۔ وہ بے رنگ کمرہ اس کے ذہن سے محو ہو گیا۔ وہ پرشور بل کھاتی ہوئی گلی، یہاں تک کے سارا ملک اس کی تمام رعنائیاں، سب محو ہو گئیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ اظہر کی لگن میں کھو جانا کوئی غلط یا مبالغہ کی بات نہیں تھی اور نہ ہی وطن کیلئے دکھی ہونا۔

لڑکا اپنے رفیق کے ساتھ چلتا رہا۔ اس نے صحن پار کر لیا اور اس نیچی سیڑھی پر آ گیا جو اظہر کی دہلیز ہے۔ اس کا دل مجسم انکسار تھا۔ مکمل عاجزی۔ لیکن اس کی روح ایک نور، ایک فخر سے بھی گئی۔ وہ نرم قدموں سے بوسیدہ چٹائیوں پر خالی جگہوں پر پیر رکھتا ہوا چلتا رہا تاکہ اس مقدس زمین کے لمس کا اعزاز حاصل کر سکے۔ اسے اس لمحہ میں اظہر بہت اچھا لگتا تھا جب نمازی جن کی آنکھوں میں ابھی غنودگی ہوتی۔ فجر کی نماز کے بعد جانے لگتے اور طالب علم کسی ستون کے گرد دائرہ بنا کر استاد کا انتظار کرتے جو انہیں حدیث، شرح یا اصول دین پر درس دیتا۔

اس وقت اظہر پرسون اور اس شور سے خالی ہوتا جو طلوع آفتاب سے مغرب کی نماز کے وقت تک اس میں گونجتا رہتا۔ یہاں لوگوں کی صرف دبی دبی آوازیں سنائی دیتیں یا تلاوت کی دھیمی مگر مستعد قرآت۔ کبھی کبھی کسی ایسے نمازی کا سامنا بھی ہو جاتا جو یا دیر سے جماعت کیلئے آتا یا نماز کے بعد سنتیں پڑھنے گیا ہوا ہوتا۔ کبھی کسی استاد کی آواز سنائی دیتی جو غنودگی کے عالم میں نماز پڑھنے کے بعد درس شروع کر دیتا لیکن جسے ابھی ناشتہ نہ کرنے کی وجہ سے نقاہت محسوس کرتی۔ وہ رندھے ہوئے سے گلے سے شروع کرتا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد لللہ رب العالمین۔ الصلوٰۃ والسلام الامولانا محمد اشرف الانبیاء و علی آلہ واصحابیہ۔ یہ صاحب کتاب کے الفاظ ہیں۔ خدا اس کی روح پر رحمت کرے اور ہمیں علم کا ثمر عطا کرے۔ آمین۔''

طلباء بھی اس غنودگی کے عالم میں درس سنتے تھے جس میں کہ وہ دیا جاتا تھا۔ صبح اور دوپہر کے درس میں شیوخ کے لہجوں میں نمایاں فرق محسوس ہوتا تھا۔ صبح کے وقت ان کی آوازیں پرسکون اور دھیمی ہوتیں جن میں کچھ کچھ غنودگی محسوس ہوتی۔ دوپہر کے وقت یہ آوازیں بلند اور سخت ہوتیں گو اب بھی دوپہر کے کھانے کی وجہ سے ان میں ایک سستی سی دکھائی دیتی۔ بھنا ہوا لوبیا اور اچار وغیرہ اظہر والوں کی خوراک کا حصہ تھے۔ صبح کے وقت آوازیں مستند اساتذہ قدیم کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتیں لیکن دوپہر کو یہی آوازیں

ان سے یوں مخاطب ہوتیں جیسے وہ ان کے حریف ہوں ۔ یہ فرق لڑکے کو حیران بھی کرتا اور محفوظ بھی ۔

وہ دو سیڑھیاں چڑھ کر اپنے دوست کے ساتھ دالان میں آ جاتا ۔ ایک متبرک ستون کے ساتھ جہاں بڑی سی زنجیر میں ایک کرسی بندھی ہوتی اس کا ساتھی ہمارے دوست کو یہ کہہ کر چھوڑ جاتا ۔ ''یہاں ٹھہرو ۔ یہاں ابھی حدیث پر درس ہو گا جب میرا درس ختم ہو جائے گا تو میں آ کر تمہیں لے جاؤں گا ۔'' اس کے ساتھی کا درس اصول دین پر تھا جس کے مصنف شیخ راضی علیہ رحمہ تھے ۔ کتاب کا نام ''التحریر ۔ الکمال ابن الحمام'' تھا ۔ جب لڑکے نے یہ فقرہ سنا تو ہر لفظ میں اسے حیرت اور دبدبہ محسوس ہوا ۔ فقہہ کے بنیادی اصول ؟ یہ کونسا علم تھا ؟ شیخ راضی ؟ یہ کون تھے ؟ وہ کون ہو سکتے ہیں ؟ ''تحریر'' ؟ اس لفظ کے کیا معنی ہیں ؟ الکمال ابن الحمام ؟ کیا اس سے زیادہ حیرت انگیز کوئی اور دو نام ہو سکتے ہیں ۔ کتنا صحیح ہے کہ علم ایک بحر بے کنار ہے ۔ ہر صاحب فکر کے لئے جو اس میں غوطہ زن ہونے کو تیار ہو اس میں بے انتہا تصور میں نہ آنے والے خزانے چھپے ہیں ۔ اس درس کیلئے لڑکے کا اشتیاق دن بدن بڑھتا گیا ۔ خصوصاً جب اس نے اپنے بھائی اور اس کے دوستوں سے اس کے متعلق سنا ۔ وہ جو کچھ پڑھ رہے تھے اسے بہت عجیب لگتا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کا شوق بڑھتا جا رہا تھا ۔

وہ جب یہ باتیں سنتا تو اس کے جذبات بھڑک اٹھتے اور اس کی خواہش ہوتی کہ کاش وہ چھ سات سال بڑا ہوتا تا کہ اسے سمجھ سکتا ۔ اس کی گتھیوں کو سلجھا سکتا اس کی الجھنوں کو دور کر سکتا اور اس مضمون پر ان ممتاز طالب علموں کا سا عبور حاصل کر سکتا اور اساتذہ سے ان کی طرح اس پر بحث کر سکتا لیکن ابھی وہ صرف سن سکتا تھا سمجھ نہیں سکتا تھا ۔ اکثر وہ کسی فقرے کے ذہن میں دہراتا رہتا تا کہ اس کے معنی سمجھ سکے لیکن اسے کچھ حاصل نہ ہوا سوائے اس کے کہ اس کے دل میں علم کا احترام اور بڑھ گیا اور اساتذہ کو وہ اور بھی قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگا اور اپنے متعلق اس میں عاجزی کے ساتھ ساتھ محنت کے عزم کا احساس پیدا ہوا ۔

خاص طور پر ایک فقرہ ایسا تھا جس نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی ۔ اس کی زندگی کے کتنے ہی دن دھندلا گئے تھے ۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے ابتدائی

درس سے غیر حاضر ہو جائے۔ جو کسی مشکل کے بغیر اس کی سمجھ میں آ گیا تھا اور روائت پر شیخ کے درس سے غیر حاضر ہو کر ان باتوں پر غور کر سکے جو وہ اپنے سینئر طالب علموں سے سنتا تھا۔

جس فقرے نے اس طرح اسے مسحور کر دیا تھا وہ یقیناً بہت قابل غور تھا۔

جب وہ نیند کی دہلیز پر ہوتا تو یہ اس کے کانوں میں گونجتا اور رات بھر کیلئے اس کی نیند غائب ہو جاتی۔ فقرہ یہ تھا ''اثبات نفی کی نفی ہے'' ان لفظوں کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ نفی کی نفی کیسے کی جا سکتی ہے؟ ایسی نفی کیا ہو سکتی ہے؟ اور نفی کی نفی اثبات کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ فقرہ اس کے ذہن میں یوں گھومتا رہتا جیسے کسی بیمار آدمی کے ذہن میں دیوانگی کی لہریں۔ یہاں تک کہ ایک دن الفکراوی کے ''مسائل'' نے اسے اس کے ذہن سے نکال دیا۔ وہ مسئلہ کو فوراً سمجھ گیا اور اس پر بحث کرنے کے قابل ہو گیا۔ اس طرح اسے علم کے بے کراں سمندر کے ذائقہ کا احساس ہونے لگا۔ لڑکا ستون کے برابر بیٹھ گیا اور تفسیر پر شیخ کا درس سنتے ہوئے اپنی زنجیر سے کھیلنے لگا۔ درس پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گیا اور اسے اس میں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آئی سوائے اس کے کہ ہر روایت پر سند کیلئے اس نے اپنے سامعین پر ناموں کی بھرمار کر دی۔ ''فلاں کا بیان ہے'' یا ''فلاں کے مطابق'' ہر روایت یوں شروع ہوتی۔ لڑکے کو ناموں کے اس لامتناہی سلسلہ کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا اور نہ منالی کے وقت طلب بیان کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ شیخ جلد یہ سلسلہ ختم کرے اور اصل روایت کی طرف آئے اور جونہی وہ موضوع پر آتا تو لڑکا ہمہ تن گوش ہو کر اسے سنتا۔ اس نے راویت کو یاد کر لیا تھا اور اسے سمجھ لیا تھا لیکن اسے شیخ کے تجزیہ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی جس سے اسے اپنے گاؤں کی مسجد کے امام کی تشریحات یاد آ جاتیں جو اسے فقہہ کی مبادیات کی تعلیم دیتا تھا۔

شیخ کے درس کے ساتھ ساتھ اظہر بیدار ہونے لگتا گویا اساتذہ کی آوازوں نے اسے جھنجھوڑ دیا ہو اور طالب علموں اور ان کے درمیان بحثوں نے جو کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے باقاعدہ لڑائی ہو رہی ہے۔ اس کو جگا دیا ہے۔ لڑکے قریب آ جاتے۔ آوازیں بلند ہوتیں ان کی گونج شیوخ کی تیز آواز میں مل جاتی تا کہ اساتذہ کی بات طلباء کے کانوں تک پہنچ سکے اور آخر بات ''والسلام علیکم'' پر آ کر رک جاتی۔ اس لئے کہ اس دوران میں کچھ اور طلبا آ جاتے جو کسی دوسرے شیخ سے فقہہ پر درس کا انتظار کرتے۔ یا شاید اسی سے۔

چنانچہ وہ مجبور ہو جاتا کہ صبح کے اس درس کو ختم کرے اور دوسرا شروع کرے۔ تب لڑکے کا ساتھی آ جاتا اور بغیر ایک لفظ کہے اس کا ہاتھ پکڑتا اور اسے دوسری جگہ کھینچ کر لے جاتا۔ وہاں وہ اسے کسی سامان کی طرح ڈال دیتا اور دوبارہ اسے چھوڑ کر چلا جاتا۔

لڑکے نے محسوس کیا کہ اسے فقہہ کی جماعت میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہ آخر تک درس سنتا۔ یہاں تک کے سب شیخ اور طلباء چلے جاتے۔ وہ اپنی جگہ اس وقت تک جما رہتا جب تک اس کا ساتھی سیدنا الحسین۔ جہاں وہ شیخ بخیت کے درس میں شریک ہوتا۔ واپس نہ آ جاتا۔

شیخ بخیت بہت زیادہ بولتا تھا اور اس کے شاگرد اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتے۔ چنانچہ اس کا درس اگلے پہر سے پہلے ختم نہ ہوتا۔ تب لڑکے کے ساتھ لوٹ کر آتا۔ بغیر ایک لفظ کہے اس کا ہاتھ پکڑتا اور اسے اظہر سے باہر لے جاتا۔ چنانچہ وہ اظہر اور اس کی اقامت گاہ کے درمیان دوسری منزل سے ہوتا ہوا آخری منزل تک پہنچ جاتا جہاں وہ پرانے قالین پر جو ایک بوسیدہ چٹائی پر بچھا ہوا تھا اپنے گوشہ تنہا میں رہ جاتا۔

۴

لڑکا کمرے کے گوشہ میں اس قالین پر بیٹھ جاتا۔ اس کا ہاتھ یا بازو بائیں طرف کی کھڑکی پر ٹکا رہتا۔ اسے خواب دیکھنے کی فرصت نہیں تھی لیکن اسے ان چیزوں کو اپنے ذہن میں دہرانے کی مہلت تھی جو زیادہ اہم ہوگئی تھیں۔ سرراہ حادثات یا اظہر کے صحن میں۔ حدیث یا فقہ پر درس میں دیئے گئے نکات لیکن یہ یادیں سرسری ہوتیں۔ اس لئے کہ جب اس کا بھائی اسے وہاں چھوڑ جاتا تو اس کی نیت یہ نہیں ہوتی تھی کہ اسے خوابوں میں گم رہنے دے یا اپنے سبق کو دہرائے۔ بلکہ وہ اتنی مہلت چاہتا تھا کہ دوپہر کیلئے کھانا تیار ہو سکے۔

روزانہ مختلف قسم کی کھانے آتے۔ مینو میں تو اتنا فرق نہ پڑتا۔ اس لئے کہ یہ ہمیشہ مکھن یا تیل میں پکے ہوئے لوبیا پر مشتمل ہوتا۔ البتہ ماحول کا خاصا اثر ہوتا۔ اس لئے کہ ایک دن ماحول پرسکون ہوتا اور دوسرے دن پرشور۔ جب لڑکا تنہا بھائی کے ساتھ ہوتا تو وہ ایک لفظ بولے بغیر بڑی تکلیف دہ اداسی کے عالم میں کھانا کھاتے۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقرے بولتے اور لڑکا صرف ہاں میں ہوں میں جواب دیتا۔ لیکن جب نوجوان شیخ کے دوست مدعو ہوتے تو کتنا ہنگامہ ہوتا۔ کبھی تین ہوتے اور کبھی چار۔ بہت کم پانچ بھی ہوتے۔ لیکن پانچویں کی اہمیت کی وجہ مختلف تھی جس کا بہتر ہے کہ ابھی ذکر نہ ہو۔

یہ نوجوان طلباء ایک ساعت کی خوش گپی کیلئے آتے۔ وہ لڑکے کو قطعی نظرانداز کر دیتے۔ اس سے ایک لفظ بھی نہ بولتے اس لئے اسے جواب دینے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔

اسے یہ اچھا لگتا تھا اس لئے کہ اسے سننے کا شوق تھا۔ اور کتنی ہی باتیں تھیں جو سننے کے لائق تھیں اور حیران کن تھیں۔ اس چھوٹی سے گول میز پر جو باتیں ہوتی تھیں ان

کے موضوعات بہت مختلف ہوتے۔ مہمان اس کے گرد فرش پر بیٹھ جاتے۔ درمیان میں ایک بڑی سی قاب رکھی ہوتی جو مکھن یا تیل میں بنی ہوئی مچھلیوں سے بھری ہوتی اور ساتھ ہی پانی میں بنے ہوئے اچار کا ایک پیالہ ہوتا۔ نوجوان پہلے پیالے سے ایک گھونٹ لیتے پھر کھانا شروع کرتے۔ پہلے ایک پیتا پھر پیالہ دوسرے کو پکڑا دیتا لیکن لڑکے کو کوئی نہ پوچھتا۔ جب وہ یہ تیز مشروب پی لیتے تو کھانا شروع کرتے۔ میز پر روٹیوں کا ڈھیر لگ جاتا جن میں سے کچھ بازار سے لائی جاتیں اور کچھ اظہر کے لنگر سے۔ کھانا کیا تھا کھانے کا مقابلہ تھا کہ کون زیادہ سے زیادہ روٹیاں کھاتا ہے۔ کتنے لقمے نیچے اتارتا ہے اور کتنا لوبیا چٹنی کی طرح نگل لیتا ہے یا شلغم کالی مرچ اور کھیرے کی کتنی مقدار اڑا جاتا ہے۔ کمرہ بیتاب ہنستی ہوئی آوازوں سے بھر جاتا۔ یہ شور بائیں جانب کی کھڑکی سے نیچے تک گلی میں گونجتا۔ دائیں طرف کے دروازے سے ہوتا ہوا اس عمارت کے کنوئیں میں برس پڑتا جہاں پہلی منزل پر یہ مزدوروں کی عورتوں کی سرگوشیوں اور ان کے جھگڑوں میں خلل کا باعث بنتا۔ عورتیں قہقہوں اور باتوں کے اس شور کو سننے کیلئے رک جاتیں جو ہوا کے جھونکے کے ساتھ ان تک پہنچتا۔ گویا انہیں بھی اس میں ایسا ہی مزہ آتا۔ جیسے کہ خورد ونوش میں مصروف ان جوانوں کو۔

لڑکا کمان کی طرح کمر کو موڑے ہوئے ان کے درمیان خاموش بیٹھا رہتا۔ جھجکتے اور گھبراتے ہوئے اس کا ہاتھ میز پر پڑی ہوئی روٹی کی طرف بڑھتا اور اس پیالہ کی طرف جو میز کے درمیان ذرا پرے کو رکھا ہوتا۔ اس کا ہاتھ دوسرے ہاتھوں سے ٹکراتا رہتا جو اتنی تیزی سے چلتے کہ تھوڑی سی دیر میں پیالہ صاف ہو جاتا۔ لڑکا پریشان ہو جاتا اور اسے کوفت ہوتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ علم کی پیاس کا لوبیے اور اچار کی چاٹ سے کیا تعلق ہے اور ان میں جو اسے باریک بینی اور ذہنی گہرائی نظر آتی تھی اس کا اس وحشیانہ بھوک سے کیا رشتہ ہے۔

وہ کھانے میں بہت دیر نہیں لگاتے تھے۔ پندرہ منٹ میں پیالہ اور میز سب صاف ہو جاتے۔ صرف ایک آدھ روٹی کا ٹکڑا لڑکے کے سامنے پڑا رہ جاتا۔ وہ آدھی روٹی سے زیادہ نہیں کھا سکتا تھا۔ یا شاید اس کا جی ہی نہ چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک میز کو اٹھاتا اور کمرے سے باہر لے جاکر جھاڑ دیتا اور پھر صاف کر کے اسے واپس کمرے میں

رکھ دیا جاتا صرف مکھن یا چٹنی کے کچھ دھبے اس پر باقی رہ جاتے۔ دوسرا کچھ کوئلے لینے جاتا اور سموار تیار کرتا۔ ایک طرح کی کیتلی جسے ایرانی اور روسی استعمال کرتے ہیں وہ اسے پانی سے بھرتا۔ پھر آگ جلا کر اور اس کے گرد کوئلے رکھ کر وہ اسے پیالہ کی جگہ رکھ دیتا اور میز کے کنارے پر چائیے کا گلاس ہوتا۔ وہ دوبارہ بیٹھ جاتا اور پانی کے ابلنے کا انتظار کرتا۔ اس کے بعد نوجوان اپنی گفتگو دوبارہ شروع کر دیتے لیکن اس مرتبہ دھیمی اونگھتی ہوئی سی آواز میں۔ اس لئے کہ اس وقت ان کی تمام قوت اس گرم، سرد، ٹھوس اور سیال مادے کو ہضم کرنے میں صرف ہو رہی ہوتی۔ پھر ایک دم سے آوازیں دھیمی پڑتیں اور خاموش ہو جاتیں۔ کمرے پر ایک سنجیدہ خاموشی چھا جاتی۔ جو صرف ایک باریک دھیمی سی سرسراہٹ سے ٹوٹتی جو پہلے رک رک کر آتی اور پھر مسلسل آتی رہتی۔

نوجوانوں پر ایک کیف کا عالم ہوتا۔ وہ سب ایک ساتھ بول اٹھتے۔ دھیمے سے لیکن مضبوط اور متوازن لہجہ میں۔ ''اللہ'' ان کی آوازیں اس لفظ کے ساتھ یوں بہہ جاتیں جیسے کسی دور کی ہلکی سی موسیقی سے بے قرار ہو گئی ہوں۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ اس لئے کہ کوئلوں پر رکھے ہوئے پانی کی سوں سوں کی آواز ان کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ جو طالب علم چائیے بنانے پر متعین تھا وہ بڑے غور سے ساوار کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، کان اور دھیان سب اس طرف تھے۔ یہاں تک کہ جب سوں سوں کی آواز ابلنے کی آواز میں بدل جاتی تو وہ چینی کی چائیے دانی لیتا اور اسے ساوار کے قریب لا کر اس طرح ٹوٹی کھولتا کہ تھوڑا سا ابلتا ہوا پانی چائیے دانی میں آ جاتا۔ پھر وہ ٹوٹی کو بلند کر دیتا اور پانی رک جاتا۔ پھر وہ چائیے دانی کا ڈھکنا بند کر کے اسے ہلاتا تاکہ یہ گرم پانی سے اچھی طرح گرم کر دے۔ جونہی چائیے دانی گرم ہوتی وہ اس پانی کو پھینک دیتا۔ اس لئے کہ چائیے نہ ٹھنڈے گلاس کو چھوئے نہ ٹھنڈے برتن کو کہ اس سے مزہ خراب ہو جاتا ہے۔ چند لمحے رکنے کے بعد وہ اس احتیاط سے پانی کو برتن میں ڈالتا کہ یہ کناروں سے نیچے رہے۔ پھر وہ ہندوستانی ڈبہ اٹھاتا اس میں سے ایک چٹکی لیتا اور اسے برتن میں ڈال دیتا۔ پھر وہ اسے اوپر تک بھر دیتا اور احتیاط سے انگاروں پر کچھ لمحے کے لئے واپس رکھ دیتا۔ پھر وہ بڑے فخر سے اسے اٹھاتا اور دوستوں سے کہتا کہ اپنے گلاس لائیں۔

اس دوران سب خاموش بیٹھے رہتے اپنے دوست کی ایک ایک حرکت پر نظر

رکھتے کہ کہیں وہ اس رسم میں گڑ بڑ نہ کر دے۔ جب گلاس بھر جاتے تو ان میں چمچ چلنے لگتے جن کی کھنکتی ہوئی آواز کانوں میں رس گھولتی۔ پھر سب اپنے اپنے گلاس ہونٹوں تک لے جاتے اور چائے کے لمبے لمبے گھونٹ لیتے اور ایسی ناخوشگوار آوازیں نکالتے کہ چمچوں کا شور دب جاتا بغیر کچھ بولے وہ پیتے رہتے سوائے چند لگے بندھے جملوں کے جو کسی ایک کو کہنے ہوتے اور دوسرے اس سے اتفاق کرتے۔

''پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے بس اتنی''! جب وہ فارغ ہو جاتے تو دوبارہ گلاس بھرے جاتے جو چائے میں تازہ پانی ڈال کر دوبارہ ابالا جاتا اب چائے میں پانی کی نسبت ان کی دلچسپی زیادہ ہوتی اس لئے کہ پانی پہلے سوں کرتا پھر جیسے بسورتا اور آخر کار (رونے میں) ابل پڑتا لیکن نوجوان نہ اس کی موسیقی کی طرف توجہ دیتے نہ گریہ کی طرف۔ وہ چائے میں محو ہوتے خصوصاً اس دوسرے دور میں۔ پہلے دور کا مقصد پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرنا ہوتا تھا لیکن دوسرا دور۔ وہ مزے کے لئے تھا اور اس پورے وجود کو ایک سکون سا ملتا صرف منہ اور گلے کے لئے تھا اور اس پورے وجود کو ایک سکون سا ملتا۔ یہ صرف منہ اور گلے کے لئے ہی نہیں بلکہ ان کے دماغ کے لئے بھی فرحت بخش تھا۔ بہر حال جب دوسرا دور ختم ہوتا تو وہ اپنے حواس میں لوٹ آتے اور پھر سے ہوشیار ہو جاتے۔ ان کی زبانیں کھل جاتیں ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی اور گفتگو میں آوازیں بلند ہونے لگتیں لیکن اب بحث کھانے پینے پر نہ ہوتی۔ اب جسمانی خواہشات سے انہیں واسطہ نہ ہوتا بلکہ وہ ذہنی مسائل کی طرف لوٹ آتے۔ انہیں یاد آتا کہ پہلے درس میں ایک شیخ نے کیا کہا تھا اور دوسرے درس میں شیخ نے کیا کہا تھا پھر وہ ان پر بحث کرتے۔ انہیں کچھ باتوں پر ہنسی آتی اور کچھ اعتراضات ان کے ذہن میں آتے۔ کچھ کو ایسا لگتا جیسے یہ بات حتمی تھی اور کچھ کو یہ غیر اطمینان بخش اور احمقانہ معلوم ہوتی ان میں سے ایک شیخ کی جگہ لے لیتا اور دوسرا شاگرد بن جاتا جو اعتراض کرتا جب کہ تیسرا ان کے درمیان منصف کا کردار ادا کرتا منصف بیچ بیچ میں مداخلت کرتا رہتا کبھی مقرر کو موضوع کی طرف توجہ دلاتا کبھی کسی کو کوئی دلیل یاد دلاتا اور کبھی بھولا ہوا مقدمہ یاد دلاتا چائے بنانے والے طالب علم کو بحث سے خارج نہیں کیا جاتا تھا لیکن اسے تاکید تھی کہ دھیان ہٹنے نہ دے۔ وہ کیتلی میں مزید چائے اور پانی ڈالتا اور گلاسوں کو خشک کر کے دوبارہ بھرتا چائے کے کم از کم تین دور چلتے عموماً

تین گلاس ہوتے ان کی تعداد بڑھ سکتی تھی کم نہیں ہوسکتی تھی۔

لڑکا بدستور اپنے کونے میں سکڑا ہوا بیٹھا تھا جھکا ہوا اور آنکھیں نیچی کئے ہوئے خاموشی کے ساتھ چائے اسے دے دی جاتی اور وہ خاموشی سے اسے پیتا رہتا۔ وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا کچھ کچھ اس کی سمجھ میں بھی آتا گو زیادہ تر اس کے پلے کچھ نہ پڑتا لیکن وہ سب کچھ سنتا جو سمجھ میں آئے نہ آئے اسے بہت متاثر کرتا۔ اور بڑی بے قراری سے اپنے آپ سے پوچھتا کہ وہ کب ان نوجوانوں کی طرح بول سکے گا اور بحث کر سکے گا۔

تقریباً ایک گھنٹہ گزر جاتا سب چائے پی چکتے لیکن میز اسی طرح رہتی۔ سماوار درمیان میں اور گلاس کناروں پر، دوپہر ہو جاتی اور محفل برخواست کرنی پڑتی تاکہ ہر ایک دوپہر کے درس میں جانے سے پہلے ایک نظر اس پر ڈال لے۔ سب نے مل کر رات کو یہ درس تیار کیا تھا لیکن ایک سرسری سی نظر ڈالنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ تاکہ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو یا کوئی الجھن ہو تو اس پر غور کیا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ متن صاف تھا اور شرح واضح۔ لیکن البنانی آسان بات کو الجھا دیتا ہے اور سیدھی سادھی گفتگو کو مشکل بنا دیتا ہے۔ السید جریانی کا تیز ذہن سادگی میں بھی گہرے اسرار ڈھونڈ نکالتا ہے جب کہ عبدالحکیم اکثر خاصا واضح ہوتا ہے لیکن وہ بھی غیر ضروری مشکلات پیدا کرتا ہے جہاں تک شارع کا تعلق ہے وہ احمق ہے جسے خود نہیں معلوم کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اب دوپہر میں چند لمحے باقی ہیں ہمیں جلد از جلد پہنچنا ہے جہاں موذن اذان دے رہا ہوگا۔ ابھی ہم راستہ میں ہی ہوں گے کہ نماز شروع ہو جائے گی ہمارے پہنچتے پہنچتے یہ ختم ہو جائے گی اور طلباء اپنے شیوخ کے گرد جمع ہونا شروع ہو جائیں گے خیر کوئی بات نہیں۔ جماعت ہم سے چھٹ گئی ہے ہم درس کے بعد اکٹھے نماز پڑھ لیں گے اور یوں جماعت بھی ہو جائے گی۔ بہتر ہے کہ درس سے پہلے جب ذہن مسائل میں الجھا ہوا ہو نماز نہ پڑھی جائے درس کے بعد جب ہم بحث کر چکے ہوں اور مسائل کو سمجھ گئے ہوں اور ان کی باریکیوں سے نکل آئے ہوں تو اس وقت ہم پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کر سکیں گے۔

لڑکے کا بھائی اسے بلا رہا تھا ''چلئے جناب اب اٹھ جائیے'' ان تمام برسوں میں وہ یہی جملہ بولتا رہا چنانچہ لڑکا اٹھا گو ابھی کچھ غنودگی باقی تھی اور اپنے بھائی کے پہلو بہ پہلو ٹکراتا لڑکھڑاتا ہوا وہ اظہر پہنچ گیا۔ اس کے رہنما نے اسے گرامر کے درس میں اس کی

جگہ پر بٹھا دیا اور خود اندھوں کی مسجد میں شیخ صالح کا درس سننے چلا گیا۔

لڑکے نے گرامر کا درس سنا اور کسی وقت کے بغیر اس کو سمجھ لیا اسے شیخ کی تشریح اور تکرار سے بہت کوفت ہوئی جب درس ختم ہو گیا اور طلباء چلے گئے تو وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ جلد یا بدیر اس کا بھائی بغیر ایک لفظ بولے اسے وہاں سے گھسیٹ کر لے جائے گا۔ اظہر سے باہر اسی سڑک پر جہاں سے وہ صبح آئے تھے اور پھر اسے کمرے میں اس کے گوشے میں ڈال دے گا جہاں بوسیدہ چٹائی پر پرانا قالین بچھا ہوا تھا اس وقت سے لڑکا خود کو شدید کرب کے لمحات کا سامنا کرنے کے لئے تیار کرنے لگا۔

MashalBooks.org

۵

جو بات لڑکے کے لئے اذیت ناک تھی وہ اس کی تنہائی تھی۔ ایک لامتناہی خلاء وہ ابھی تک دوپہر سے لے کر اسی گوشہ میں بیٹھا تھا جہاں اس کا بھائی اسے چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ساتھ عمارت کے کسی اور گوشہ میں چلا گیا تھا۔ ملاقات کے لئے جگہ معین نہ تھی صبح کوئی کمرہ ہوتا دوپہر کوئی اور شام کو کوئی اور۔

دوپہر کے درس کے بعد اس کا بھائی اسے ایک لمبے عرصہ کے لئے تنہا چھوڑ جاتا یہ عرصہ روزانہ گھٹتا بڑھتا رہتا۔ یہ ٹولی بڑی بے فکری سے وقت گزارتی۔ ہنسی مذاق اور استادوں اور طالب علموں کے متعلق مزے لے لے کر قصے بیان کئے جاتے ان کی آوازیں بلند ہوتیں اور ان کے قہقہے عمارت میں گونجتے اور گوشتہ میں سکڑے ہوئے اس لڑکے کے کانوں تک پہنچتے۔ اسکے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی بکھر جاتی لیکن دل میں ایک درد رہتا اس لئے ان کی باتیں اس کو سنائی نہ دیتیں۔ صبح کے وقت وہ کم از کم ان کے لطیفے تو سن سکتا تھا اور ان کی چرب زبانی سے اس ہنگامہ میں اس کے ہونٹوں پر بھی کچھ مسکراہٹ کھل جاتی۔

بعد میں جو کچھ ہوا وہ لڑکا اچھی طرح جانتا تھا وہ جلد ہی اس تفریح سے اکتا جاتے اور استادوں اور ہم جماعتوں کے متعلق کہانیاں سناتے سناتے تھک جاتے پھر دوپہر کی چائے پر وہ نہایت متانت کے ساتھ سلیقہ سے گفتگو کرتے پھر ان نکات پر غور کرتے جو دوپہر کے درس میں ابھر کر سامنے آئے تھے۔ پھر وہ شام کے درس کی تیاری کرتے جو امام شیخ محمد عبدہ کبھی دلدل العجاز کے موضوع پر دیتے اور کبھی قرآن پر۔ اس درس کی تیاری

MashalBooks.org

کے دوران وہ امام کے متعلق بھی گفتگو کرتے اس کی غیر معمولی صلاحیتوں پر تبصرہ کرتے۔ شیوخ کے متعلق اس کی رائے کا ذکر کرتے یا اس کے اپنے متعلق ان کے خیالات کو اور ان منہ توڑ جوابوں کو یاد کرتے جن سے معترفین اور سوال کرنے والوں کے منہ بند ہو جاتے اور وہ اپنے ساتھیوں کے مذاق کا نشانہ بنتے۔ لڑکے کا بہت جی چاہتا ان کے ساتھ رہے اور ان کی باتیں سنے، شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا جی ان کے ساتھ چایئے پینے کو بھی چاہتا تھا۔ صبح، دوپہر اور شام چایئے کی خواہش کرنے میں وہ ان سے کچھ مختلف نہیں تھا لیکن وہ اس سے محروم تھا دوسرے صرف چند قدم پر سے مذاق کرتے بحث کرتے، پڑھتے اور چایئے پیتے لیکن وہ ان میں شامل نہیں ہو سکتا تھا نہ ہی وہ اپنے بھائی سے ان ذہنی اور جسمانی مشاغل میں شمولیت کے لئے درخواست کر سکتا تھا۔

وہ خود کو ایسی کوئی درخواست کرنے پر مائل نہ کر سکا اس لئے کہ کسی سے کچھ مانگنا اس کے لئے ناقابل برداشت تھا اگر وہ اپنے بھائی سے اس کے متعلق بات کرتا تو قطع نظر اس کے کہ جواب نرمی سے دیا جاتا یا اسے جھڑک دیا جاتا۔ دونوں صورتیں اس کے لئے اذیت ناک ہوتیں۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ وہ ضبط کرے علم کے لئے اپنی لگن کے متعلق کچھ نہ کہے نہ گفتگو کی خواہش کا اظہار کرے اور نہ ہی چایئے کی طلب کا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ قطعی طور پر خود کو علیحدہ رکھے۔ اپنے گوشہ میں خاموشی سے دبکا رہے اور اپنے خیالات میں مگن رہے لیکن یہ کس طرح ممکن تھا جب کہ اس کے بھائی نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے پہلے وہ انکی آوازیں اور قہقہے سنتا اور پھر ایک منٹ کی خاموشی کے بعد اسے کوئلہ توڑنے کی آواز آتی جو اس وقت کا میزبان چایئے بنانے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ ان آوازوں سے اس میں ایک خواہش بھی پیدا ہوتی اور ایک طرح کا خوف بھی، امید بھی اور مایوسی بھی جو اسکی ہمت توڑنے کے لئے کافی تھی اور اس کے لئے بہت تکلیف دہ تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ جگہ سے ہل تک نہیں سکتا تھا۔ کمرے کے دروازہ تک چند قدم بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا تاکہ آوازوں کو قریب سے سن سکے اور کچھ لفظ اس کے کان میں پڑ جائیں۔ یہ اس کے لئے بہت تسلی کا باعث ہوتا لیکن افسوس وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا یہ نہیں کہ اسے کمرہ کا راستہ معلوم نہیں تھا وہ تو بہت پہلے سے جانتا تھا بلکہ اس لئے کہ یہ جھجک تھی کہ کوئی راہگیر اسے چوری چھپے یوں تاکا جھانکی کرتے دیکھ نہ لے۔ زیادہ خطرہ یہ تھا کہ

کہیں اس کا بھائی ہی اس کی چوری نہ پکڑ لے اس لئے کہ وہ وقت بے وقت کمرے میں آتا جاتا رہتا تھا کوئی کتاب لینے یا شاید چائے کے ساتھ کوئی چیز لینے۔ وہ سب سے زیادہ اس بات سے گھبراتا تھا کہ اسے ادھر ادھر بھٹکتا ہوا دیکھ کر اس کا بھائی اس سے یہ نہ پوچھ لے کہ ''تمہیں کیا چاہئے''،''تم کہاں جارہے ہو'' چنانچہ اس نے محسوس کیا کہ زیادہ بہتر یہی ہے کہ وہ جہاں ہے وہیں رہے۔ اپنی خواہشات کو دبائے اور دور گاؤں میں اپنے گھر کی یادوں کی تلخی کو بھی بھول جائے۔

ہاں جب وہ سکول سے واپس آتا کھیل کھیل کر تھکا ہوا تو ایک سوکھی روٹی اس کی خوراک ہوتی اور وہ اپنی بہن سے ہنسی مذاق کرتا یا ماں کو اس روز سکول میں ہونے والی کوئی دلچسپ بات بتاتا جب وہ گھر میں اکتا جاتا تو باہر جا سکتا تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ گھر کے سامنے والی دیوار تک چلتا پھر اسکے ساتھ جنوب کی طرف کچھ دور جا کر دائیں طرف مڑ جاتا اور کچھ دیر میں ایک دوکان تک پہنچ جاتا۔ جو شیخ محمد عبدالواحد اور اس کے چھوٹے بھائی الحاد محمود کی دوکان تھی۔ یہاں وہ باتیں کرتا کہانیاں سنتا اور شیخ کے گاہکوں کی باتیں سنتا جن میں مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ جن کی سادہ دیہاتی گفتگو میں اسے مزہ آتا کہ یہ نہ صرف عجیب سی اور بڑی رنگ برنگی ہوتی بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں ایک طرح کی معصومیت ہوتی۔

بعض اوقات زیادہ گاہک نہیں ہوتے تھے تب دوکان کا مالک جو کسی کام میں مصروف نہ ہوتا لڑکے سے بات چیت شروع کر دیتا یا اسے کوئی کتاب پڑھ کر سناتا۔ کبھی کبھی دوکان پر جانے کے بجائے لڑکا گھر سے باہر چلا جاتا اور آلتی پالتی مار کر دیوار سے لگی ہوئی بنچ پر بیٹھ جاتا اور وہاں سہ پہر سے لے کر مغرب کی اذان اور کھانے کے وقت تک وہ خاموشی سے اپنے باپ اور اس کے دوستوں کی باتیں سنتا۔

کبھی باہر جانے کے بجائے لڑکا گھر میں ہی اپنے دوست کے ساتھ ٹھہر جاتا جو اس سے ملنے آتا اور اس کے لئے پند و نصیحت کی کتاب یا اسلام کی فتوحات کے قصے لے کر آتا۔ پھر غروب آفتاب تک جب کھانے کا وقت ہو جاتا تو وہ اسے کتاب میں سے پڑھ کر سناتا رہتا۔ اس طرح لڑکے کو کبھی تنہائی محسوس نہیں ہوئی نہ اسے بھوک یا دوسروں کی بے اعتنائی کا احساس ہوا نہ چائے کی طلب اور نہ ہی بیکاری کی اذیت۔

وہاں بالکل بے حس وحرکت لیٹے ہوئے یہ سب یادیں اس کے ذہن میں ہجوم کرتی رہیں۔ کچھ دیر کیلئے مسجد بیبرس سے عصر کی اذان نے اس کے خوابوں کو منقطع کر دیا۔ یہ آواز لڑکے کو بہت ناگوار گزری۔ یہ اسکے گاؤں کی مسجد کے موذن کی آواز کے مقابلہ میں بہت کرخت تھی۔ اس جیسی سریلی آواز اس نے کہیں نہیں سنی۔

کتنی ہی بار یہ شخص لڑکے کے ساتھ شفقت اور پیار سے پیش آیا تھا اور کیسے کیسے طریقوں سے اس کی دلجوئی کرتا تھا۔ کتنی ہی مرتبہ وہ اسے مینار پے لے گیا تھا اور اس سے اذان دلوائی تھی اور کتنی ہی مرتبہ مناجات میں اس کا ساتھ دیا تھا لیکن یہاں اس کمرے میں اذان کی آواز سے لڑکے کو کوفت ہوئی۔ اس لئے کہ نہ وہ اس کا ساتھ دے سکتا تھا نہ اسے معلوم تھا کہ یہ کہاں سے آرہی تھی۔ وہ کبھی مسجد بیبرس میں نہیں گیا تھا نہ اسے اس کے مینار کا راستہ معلوم تھا۔ اس نے کبھی اس کی سیڑھیوں پر قدم نہیں رکھا تھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ زینہ سیدھا اور کشادہ تھا یا اس کے گھر کی مسجد کے زینہ کی طرح تنگ اور بل کھاتا ہوا۔

ان سب چیزوں کا اسے بالکل علم نہیں تھا اور نہ ان کا جاننا اس کے لئے ممکن تھا۔ وہ تو صرف انتظار کر سکتا تھا، اور بے بس تھا۔ آہ۔ علم کی تڑپ بھی انسان کو کیسی کیسی مصیبتوں میں ڈالتی ہے۔

یہ کبھی ختم نہ ہونے والا خلاء سخت صبر آزما تھا۔ اپنی چٹائی پر بیٹھا ہوا وہ اونگھنے لگتا اور اکثر وہ لیٹ جاتا اور نیند کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ سہ پہر کو سونا جسم کے لئے بھی اور دماغ کے لئے بھی سخت مضر ہوتا ہے لیکن وہ بے بس تھا وہ اس مکروہ غنودگی سے کیسے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔

اسے ایک آواز آئی جس کے الفاظ سال بہ سال اس کے کانوں میں گونجتے رہے اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ''جناب۔ کیا آپ سو رہے ہیں؟'' یہ اس کے بھائی کی آواز تھی جو کھانے کے لئے اسے بلانے آیا تھا اور یہ دیکھنے کے لئے بھی کہ اس کی پڑھائی کیسے کی جا رہی ہے۔ کھانا بہت اچھا تھا۔ ایک روٹی، یونانی پنیر کا ایک ٹکڑا یا سم سم کیک کا ایک حصہ۔ چھٹی کے علاوہ ہر روز اس کا بھائی آتا۔ اس کے سامنے کھانا رکھتا اور خدا حافظ کہہ کر اظہر میں امام کے درس میں شریک ہونے کے لئے چلا جاتا۔

لڑکا کسی قدر بے صبری کے ساتھ کھانے پر پل پڑا۔ چاہے بھوک تھی یا نہیں۔ چھوڑا اس نے کچھ بھی نہیں۔ جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ ہوتا تو عموماً بہت کم کھاتا اور اس کا بھائی اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا تھا لیکن جب وہ تنہا ہوتا تو سب کچھ کھا جاتا۔ خواہ اسے بالکل بھوک نہ ہو۔ اسے ڈر تھا کہ اس کا بھائی واپس آئے گا تو دیکھے گا کہ اس نے کھانا چھوڑ دیا ہے اور سوچے گا کہ یا وہ بیمار ہے یا ناخوش ہے اور وہ قطعی طور پر یہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے بھائی کیلئے دکھ یا تشویش کا باعث بنے۔

چنانچہ اس نے جم کے سب کچھ کھا لیا۔ فارغ ہو کر وہ اپنے گوشہ میں چلا گیا اور ایک بے چین سی کاہلی اس پر سوار ہو گئی جیسے جیسے دن ڈھلنے لگا اور سورج مغرب میں غروب ہونے لگا لڑکے پر ایک دکھ کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی۔ موذن نے مغرب کی اذان دی اور دن کے ختم ہونے کا اعلان کیا۔ اس نے سایوں کو ڈھلتے ہوئے محسوس کیا اور اس کو خیال آیا کہ اگر کوئی اور بھی اس کمرہ میں ہوتا تو چراغ جلا دیتا اور سائے دور ہو جاتے لیکن وہ تنہا تھا اور جہاں تک آنکھوں والوں کا تعلق تھا اسے چراغ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لڑکے کو یقین تھا کہ وہ غلطی پر تھے۔ اس لئے کہ اس زمانے میں وہ روشنی اور اندھیرے میں امتیاز کر سکتا تھا اگر چراغ جلتا تو اسے مانوسیت اور رفاقت کا احساس ہوتا جبکہ اندھیرے میں مکمل محرومی کا شاید یہ محض تخیل کی اڑان تھی یا اس کا سبب اس کی بے چین طبیعت تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کانوں سے اسے اندھیرے کا احساس ہو جاتا کہ مچھر کی سی بھنبھناہٹ جیسی لیکن ذرا تیز اور کرخت سیٹیاں ان میں بجنے لگتی تھیں۔ یہ آوازیں اس کے کانوں میں چبھتی تھیں اور اس کے دل میں ایک خوف سا پیدا کرتی تھیں۔ مجبوراً وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ کہنیاں گھٹنوں پر رکھ لیتا اور اپنے سر کو ہاتھوں میں چھپا کر وہ خود کو اس ناگزیر آواز کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔ اگر سہ پہر کے وقت تنہائی کی وجہ سے اسے نیند آ جاتی تو شام اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیتی جو اسے کسی ڈراؤنے خواب سے بھی زیادہ مہیب لگتا۔

ممکن تھا کہ وہ اندھیرے کی آواز کا عادی ہو جاتا بلکہ شاید یہ اس کے لئے طمانیت کا باعث بھی بن جاتی لیکن کمرے میں اور آوازیں بھی تھیں جو سب مل کر اسے پاگل بنا دیتی تھیں یہ جگہ وقت کل ملکیت تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی بنیاد وقت کی گہرائیوں میں کہیں کھو گئی تھی۔ اس کی دیواریں امتداد زمانہ سے بوسیدہ ہو گئی تھیں اور جگہ

MashalBooks.org

جگہ سے ٹوٹ گئی تھیں جو کیڑوں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں سے بھری ہوئی تھیں اور لڑکا جب رات کو سمٹا ہوا سو رہا تھا تو یہ حشرات الارض اس کی طرف متوجہ رہتے۔ ہلکی ہلکی سی سرسراہٹ ہوتی۔ ادھر ادھر کچھ حرکت ہوتی۔ کبھی خاموشی سے کبھی تیزی سے اور لڑکا خوف سے تھرتھرا جاتا۔ جب اس کا بھائی آتا۔ اکیلا یا دوستوں کے ساتھ اور چراغ جلتا تو یہ تمام آوازیں اور حرکتیں یوں رک جاتیں۔ جیسے کبھی تھیں ہی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی اسے یہ ہمت ہی نہیں ہوئی کہ ان کا ذکر کرے۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے ان کے متعلق بات کی تو لوگ کم از کم اسے احمق سمجھیں گے یا اس کی جرأت یا عقل پر شک کرینگے۔ چنانچہ اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا اور جتنا ہو سکا اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی۔

موذن دن کی آخری اذان دے رہا تھا۔ ایک لمحہ کیلئے اس میں امید کی ایک رمق پیدا ہوئی اور اس کے بعد وہ مکمل مایوسی میں ڈوب گیا۔ امام کا درس ہو چکا تھا اور اس کا بھائی ابھی آ کر چراغ جلا دے گا اپنا بستر رکھے گا اور کوئی کتاب یا کھانے کی چیز اٹھائے گا اور یوں کمرے میں ایک سکون ایک اطمینان کی فضا پھیل جائے گی اوا س نا قابل برداشت تنہائی کا احساس ختم ہو جائے گا لیکن پھر وہ لڑکے کے اوپر اس کا بستر پھینک دے گا اور اتنی دیر کھڑا رہے گا جب تک وہ خود کو کمبل میں لپیٹ نہ لے اور تکیہ پر سر نہ رکھ لے۔ پھر وہ چراغ بجھا کر دروازہ بند کر کے باہر جائے گا اور قفل میں چابی گھمائے گا۔ یقیناً وہ سمجھ رہا ہوگا کہ لڑکا سو گیا ہے جبکہ حقیقت میں وہ اسے ایک شدید خوفناک بے خوابی میں ڈال گیا تھا۔

تین چار گھنٹے کے بعد وہ کھانا کھا کر چائے پی کر واپس آتا۔ دوستوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا اور اگلے دن کے درس کے لئے ان کے ساتھ تیاری کرتا۔ وہ تالے میں چابی گھماتا اور چراغ جلاتا۔ اسے یہی خیال رہتا کہ لڑکا میٹھی نیند سو رہا ہے جبکہ حقیقت میں اس کی آنکھ بھی نہیں جھپکی تھی اور وہ سخت خوف کے عالم میں بھائی کے آنے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ نوجوان نے بتی بجھائی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ جلد ہی اس کی سانسوں کی کبھی غیر ہموار اور کبھی پرسکون آواز سے اندازہ ہوتا کہ وہ سو گیا ہے۔ تب آخر کار لڑکے میں ایک خوشگوار آزادی کا احساس موجزن ہوتا۔ اس کا دل اعتماد سے بھر جاتا اور اس کا ذہن ایک اطمینان بخش سکوت میں ڈوب جاتا۔

اور پھر بغیر کسی قسم کا احساس آئے وہ شعور سے نیند کی دنیا میں چلا جاتا۔

۶

اچانک وہ دو عجیب آوازوں سے چونک کر اٹھ گیا۔ فرش کو پیٹتی ہوئی ایک بھاری سی لکڑی اور ایک کانپتی ہوئی انسانی آواز جو بڑے گھبراہٹ کے عالم یں کئی منٹ تک خدا کی حمد وثنا کرتی رہی۔ لکڑی کو پیٹنے کے دوران رات کے اس مکمل سکوت میں گونجتی ہوئی یہ کپکپاتی آواز کتنی غیر متوقع تھی۔ شروع میں لکڑی کی چوٹ اتنی زور سے پڑی کہ ساری رات تھرتھرا اٹھی۔ پھر یہ آواز قریب آتی گئی یہاں تک کہ لڑکے کے کمرے میں پہنچ گئی۔ پھر دوسری طرف مڑ گئی اور آہستہ آہستہ دھیمی پڑتی گئی یہاں تک کہ بالکل مدھم ہو گئی۔ یہ آواز پھر اٹھی۔ بلند اور طویل۔ جب کہ وہ شخص زینہ کے نیچے تک پہنچ گیا اور گلی میں اپنی راہ ہولیا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ دور ہوتی گئی اور آخر بالکل ختم ہوگئی۔

یہ آواز بلکہ آوازوں کا ہجوم۔ جب لڑکے نے پہلی بار سنا تو وہ ڈر گیا۔ اس نے اپنے دماغ پر بہت زور ڈالا کہ یہ کیا شور تھا اور کہاں سے آرہا تھا۔ لیکن بے سود۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ وہ پھر سونے کے قابل نہ رہا اور باقی تمام رات اس نے بڑے اضطراب میں گزاری۔ صرف موذن کی آواز ''نماز نیند سے بہتر ہے'' سن کر اسے کچھ حوصلہ ہوا اور سکون ملا۔ لڑکا خوشی خوشی، بغیر کسی پریشانی کے اٹھا لیکن اس کا بھائی سخت جلدی میں تھا۔ منٹوں میں وہ زینے کے نیچے اتر گئے اور اظہر کی طرف چل پڑے جہاں ایک کو بنیادی اصولوں کے درس میں شریک ہونا تھا اور دوسرے کو حدیث پر۔

یہ دوہری آواز لڑکے کو روزانہ صبح سویرے اٹھا دیتی۔ یہ اسے خوفزدہ بھی کرتی اور حیران بھی لیکن وہ اپنے بھائی یا کسی اور سے اسکے متعلق بات نہیں کرسکتا تھا۔ پھر جمعہ آ

جاتا۔ پھرایسی آوازیں آتیں جن سے اس کا دماغ پھٹ جاتا اور وہ اٹھ جاتا۔ پھرموذن کی آواز اس کے لئے سکون کا باعث ہوتی۔ بس اتنی ہی بات تھی۔ ابھی ان دونوں میں سے کسی کو اٹھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نہ نوجوانوں کو زور لگانا پڑتا نہ لڑکا کوئی تساہلی کرتا۔ اس لئے کہ جمعہ کی صبح کو درس نہیں ہوتا تھا اور لڑکے کی نیند خراب نہیں ہوتی تھی۔

بدقسمتی سے لڑکے کی نیند بہت پہلے ہی اس پراسرار آواز اور کھٹ کھٹ سے خراب ہو چکی تھی لیکن اس کا بھائی ہمیشہ کی طرح ان دونوں کے باوجود سوتا رہا۔ چنانچہ لڑکا بستر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ گویوں بے حس و حرکت پڑے رہنے سے اسے کوفت ہوتی تھی لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی ہل چل سے اس کے بھائی کے آرام میں خلل پڑے۔ پھر صبح ہوئی۔ فجر کا وقت ہوا۔ سورج طلوع ہوا اور اس کی کرنوں سے آہستہ آہستہ کمرہ بھر گیا۔ لیکن سنو! پھر وہی دو آوازیں لیکن اس مرتبہ بہت دھیمی اور پرسکون۔ لکڑی آہستہ آہستہ زمین پر پڑ رہی تھی اور لگتا تھا کہ سرگوشی کے سے انداز میں فضا میں رس گھول رہی تھی۔ لڑکا حیران ہو گیا۔ رات کے سناٹے میں جب لوگ سو رہے ہوں اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہو تو یہ آوازیں اتنی کرخت اور تیز کیوں ہو جاتی ہیں جبکہ دن چڑھنے کے بعد یہ دھیمی اور نرم پڑ جاتی ہیں جب ہر شخص اٹھا ہوا ہوتا ہے اور کسی کو شور و غل پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ بہرحال لڑکے کو بالکل ساکت رہنا پڑا تاکہ اس کا بھائی جاگ نہ اٹھے۔ آخر کار دھوپ اتنی تمازت سے اس کی پیشانی پر پڑی کہ وہ اٹھ کے بیٹھ گیا اور سستی سے ادھر ادھر ہلتا ہوا اس سے پرے ہٹ گیا اور دوبارہ سونے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ اٹھنے کے لئے قطعی تیار نہیں تھا اور لڑکا بہت پریشان اور جز بز تھا۔ پھر دروازہ پر زور کی دستک ہوئی اور دوسری طرف سے غصہ میں چلاتی ہوئی آواز آئی ''لڑکو! اٹھ جاؤ۔ نکمو! اٹھ جاؤ اور کتنی دیر سونا ہے۔ اللہ معاف کرے۔ تم کتنے گنہگار ہو۔ خود کو مسلمان طالب علم کہتے ہو تم! اور دوپہر تک سوتے ہو۔ وقت پر نماز ادا نہیں کرتے۔ اٹھو! مردودو! اٹھو!''

جونہی اس چلانے والے نے دروازہ کھٹکھٹایا اور زمین پر لاٹھیاں مارنی شروع کیں ہر طرف سے قہقہے بلند ہونے لگے۔ نوجوان شیخ پہلی ہی ڈانٹ پر اٹھ گیا تھا لیکن وہ وہیں لیٹا رہا اور آپ ہی آپ چپکے چپکے ہنستا رہا۔ ظاہر ہے وہ اس ڈانٹ ڈپٹ اور لاٹھیوں کی آواز کا مزہ لے رہا تھا اور جتنا ممکن ہو مزید آرام کرنا چاہتا تھا۔ لڑکا آواز اور لاٹھی

دونوں کو پہچان گیا تھا۔ یہ وہی تھیں جو روزا اور اس کے پاس کیسی لاٹھی تھی؟ یہ قہقہے کیوں بلند ہوتے تھے؟ نوجوان زور سے ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے دروازہ کھولا۔ وہ شیطان چلاتا ہوا اندر آیا۔ ''خدا بچایئے۔ مردودو۔ بے ایمانو! اللہ ہمیں تمہارے گناہوں سے بچایئے اور شیطان کے فریق سے محفوظ رکھے! تم انسان ہو یا جانور مسلمان ہو یا کافر! کیا تمہارے شیخ نے تمہیں نیک و بد کی تمیز نہیں سکھائی ہے؟''

ساتھ ہی ساتھ نوجوان کے دوست بھی کمرے میں گھس آئے۔ ہنسی سے ان کا برا حال تھا۔ پھر ہمارے دوست کو معلوم ہوا کہ یہ چچا علی تھے۔

چچا حاجی علی ۷۰ سال کا بڑھا تھا جو ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے بہت ضعیف ہو گیا تھا۔ وہ بہت تیز۔ پہر کار اور بزلہ سنج تھا۔ چوڑے شانے۔ پھرتیلا اور مضبوط کاٹھی۔ ذرا چھیڑو تو ابل پڑتا تھا اور بات کرنے میں سخت اکھڑ۔ وہ آہستہ بول ہی نہیں سکتا تھا اور سرگوشی کو تو وہ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ وہ بے تکان چلاتا تھا۔ جیسا کہ لڑکے کو بعد میں معلوم ہوا چچا حاجی علی شروع میں ایک تاجر تھا۔ وہ سکندریہ میں پیدا ہوا تھا اور وہیں پلا بڑھا تھا اور سکندریہ والوں کی سب خوبیاں اور سب اکھڑ پن اس میں تھا۔ وہ چاول کی تجارت کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا نام حاجی پڑ گیا تھا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس نے تجارت چھوڑ دی۔ بلکہ یوں کہیے کہ تجارت نے اسے آزاد چھوڑ دیا اور چونکہ قاہرہ میں اس کا ایک مکان تھا جہاں سے اسے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی اس لئے وہیں اس نے ایک کمرہ لے لیا گو سوائے دو ایرانیوں کے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہاں سب اظہری ہی رہتے تھے۔

حاجی علی کا کمرہ عمارت کے پرلے کونے میں تھا۔ سیڑھیوں کے بائیں طرف۔ وہ اکثر وہاں اپنے خوش باش طالب علم دوستوں کے ہجوم میں پایا جاتا۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ ایک بہت قریبی رشتہ قائم ہو گیا تھا جس کی بنیاد مخلصانہ لگاؤ پر تھی۔

اس سن رسیدہ شخص کو علم کے لئے ان کی پیاس کا بخوبی اندازہ تھا اور کاہلی اور عامیانہ پن سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ اسے ان کی یہ باتیں بہت پسند تھیں چنانچہ ہفتہ بھر وہ ان سے دور رہتا اور وہ اس سے۔ جیسے وہ انہیں جانتا ہی نہ ہو۔ سوائے اسکے کہ کبھی کبھی وہ اسے چایئے یا کھانے پر دعوت دے دیتے یا خود اس سے ملنے کے لئے چلے آتے لیکن جب جمعہ آتا تو پھر وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ دن چڑھے تک ان کا

انتظار کرتا کہ وہ پوری طرح سو لیں اور آرام کر لیں۔ پھر وہ برآمدہ میں آتا اور پہلے نوجوان کے کمرہ سے لے کر سب کو شور مچا کر اٹھاتا چلا جاتا اور ایک ایک کر کے تمام کمروں کا چکر لگاتا۔ یہاں تک کہ وہ اس آخری کمرے میں پہنچ جاتا جس میں ہمارے دوست کا بھائی رہتا تھا۔ خوش باش لوگوں کا ہجوم اسے گھیرے رہتا جو اس چھٹی کے دن کو قہقوں سے شروع کرتے اور مسکراتی ہوئی زندگی کے ساتھ مسکراتے۔

جمعہ کے روز یہ معمر شخص ان کے کھانے کا اہتمام کرتا اور ان کی خوشیوں کا خیال رکھتا۔ وہ ان کے لئے دوپہر کے کھانے کا انتخاب کرتا اور اسے تیار کراتا۔ اپنے کمرے میں یا ان میں سے کسی کے کمرے میں۔ شام کا کھانا اس کی پسند کا ہوتا وہ انہیں مشورہ دیتا کہ کیا پکانا چاہئے۔ وہ کھانے کی نگرانی کرتا اور وہاں موجود رہتا تا کہ کچھ گڑ بڑ ہو جائے تو اسے ٹھیک کر سکے۔ صبح وہ ان کے ساتھ گزارتا پھر ظہر کی نماز کے لئے چلا جاتا اور پھر عصر تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ اس کے بعد وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتا اور چائے پیتا۔ وہ مغرب کی نماز میں ان کی امامت کرتا اور اندھیرا ہونے کے بعد عشاء کی نماز کے لئے چلا جاتا اور ان کو اگلے روز کا درس تیار کرنے کیلئے چھوڑ جاتا۔

چچا حاجی علی کی شخصیت بے داغ تھی۔ درحقیقت وہ حد درجہ مذہبی تھا۔ وہ روزانہ طلوع آفتاب سے پہلے اپنے گشت پر نکل جاتا۔ زور زور سے خدا کی حمد کرتا اور اپنی لاٹھی کو زمین پر مارتا ہوا مسجد سیدنا حسین کی طرف روانہ ہو جاتا۔ وہاں وہ صبح کی مناجات پڑھتا اور فجر کی نماز میں شامل ہو جاتا۔ وہ منہ ہی منہ میں دعائیں پڑھتا اور لاٹھی سے زمین پر مختلف شکلیں بناتا ہوا واپس آتا اور کچھ دیر اپنے کمرے میں آرام کرتا۔ وہ بقیہ نمازیں اوقات کے مطابق اپنے کمرے میں پڑھتا۔ قرآن کی تلاوت کرتا اور بلند آواز میں اللہ کی حمد کرتا۔ اس کمرے کا دروازہ کھلا رہتا تا کہ اس کی آواز سب تک پہنچے لیکن جب وہ اپنے نوجوان دوستوں کے ساتھ ہوتا۔ کھانا کھاتے ہوئے۔ چائے پیتے ہوئے یا شام گزارتے ہوئے تو پھر وئی ایس جیسا بذلہ سنج۔ مزاحیہ۔ باتونی اور زندگی سے چھلکتا ہوا نہ ہوتا اور انسانی کمزوریوں میں بھی وہ کسی سے کم نہ ہوتا۔ سکینڈلز میں اس کو حیرت ناک حد تک کمال حاصل تھا۔ اس کی زبان قطعی بے لگام تھی وہ بڑی اونچی آواز میں فحش کلمات اور گالیاں نکالتا۔ کوئی لفظ اس کے لئے گندہ نہیں تھا۔ کوئی بات فحش نہیں تھی اور کوئی تشبیہہ یا استعارہ

MashalBooks.org

اس کے لئے ناممکن نہیں تھا۔ وہ سب سے خوب مزے لیتا۔

اس کے باوجود نوجوان اس کو چاہتے تھے۔ وہ بڑی عقیدت کے ساتھ اس سے وابستہ تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ انہیں زندگی کی یکسانیت کی بدمزگی سے بچاتا تھا اور انکے لئے مسرت وانبساط کے دروازے کھول دیتا تھا۔ جن تک ان کی رسائی ممکن نہیں تھی اور وہ گھنٹوں اس کی یاوہ گوئی کو سن سن کر خوش ہوتے رہتے۔ وہ سب کچھ سنتے اور اتنا ہنستے کہ ان کی پسلیاں دکھنے لگتیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس بزرگ شخص کی کسی گالی یا فحش کلامی کا جواب نہ دیتے۔ لگتا تھا کہ وہ محض ایک تماشا دیکھ رہے ہیں جس کا وہ دور سے ہی لطف اٹھاتے اور اس کے قریب آنے یا اس میں شامل ہونے کی کوشش نہ کرتے۔

ان تمام باتوں سے ان طالب علموں کی ایک خصوصیت کا اظہار ہوتا تھا جس کے لئے وہ تعریف کے مستحق تھے مگر جس کی وجہ سے وہ قابل رحم بھی تھے۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی بہ نسبت خود کو قابو میں رکھتے تھے اور اپنی خواہشات کو دبانے کے اہل بھی تھے جس کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم پر پوری توجہ دے سکتے تھے اور اپنے کچھ دوسرے ساتھیوں کی طرح گھٹیا قسم کی تفریح میں نہیں پڑتے تھے۔ جو اعتماد کو کمزور کرتی تھی قوت کو زائل کرتی تھی اور کردار کو تباہ کرتی تھی۔ لڑکا یہ سب باتیں سنتا۔ ہر بات کو سمجھتا اور ذہن میں محفوظ کر لیتا لیکن یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ علم کی طلب اور یہ پھکڑ پن کس طرح ایک ساتھ چل سکتے تھے۔ اس نے خود سے عہد کیا کہ جب وہ بڑا ہوگا اور ان کی عمر کو پہنچے گا جن کی ذہانت کا وہ اس قدر معترف ہے تو وہ ان کی طرح یوں بے کار باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرے گا۔

مختصر یہ کہ جمعہ ان کے لئے اور ان کے دوستوں کے لئے کھانے پینے کا دن ہوتا۔ صبح کے وقت وہ شور کرتے جمع ہوتے۔ لوبیا اور انڈوں کا ناشتہ کرتے اور چائے کے ساتھ گھر کے بنے ہوئے بسکٹ کھاتے جو سوکھے اور سخت ہوتے جو انکی مائیں بڑے شوق سے ان کے لئے بھیجتیں اور جنہیں وہ بڑے پیار سے تیار کرتیں۔ لڑکا یہ نہیں بھول سکتا تھا کہ کس طرح اس کا باپ سخت محنت سے کچھ پیسے لا کر اسکی ماں کو دیتا تھا کہ وہ ان کے لئے یہ بسکٹ تیار کر سکے۔ وہ کتنی محنت سے انہیں بناتی تھی اور انہیں تیار کر کے کتنی خوش ہوتی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ انہیں سنبھال کر رکھتی اور انہیں سٹیشن لے جاتے ہوئے وہ کتنا روتی۔

جب نوجوان بسکٹ بھنبھوڑ رہے ہوتے تو لڑکا ان یادوں میں گم ہوتا۔ کبھی وہ چچا حاجی علی کی طرح بسکٹوں کو چائے میں ڈبو ڈبو کر کھاتے۔ کبھی وہ کچ کچ کرتے ہوئے دانتوں سے انہیں پیستے اور چائے کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے نیچے اتار لیتے۔ اس تمام عرصہ میں وہ بوڑھے آدمی کے مسخرہ پن پر ہنستے رہتے اور اپنے باپوں کی محنت اور ماؤں کے آنسوؤں کو قطعی بھلا دیتے۔

دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد چائے کے دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان یہ بزرگ اور اس کے نوجوان دوست شام کے کھانے کی تیاریاں شروع کر دیتے تھے۔ یہ منظر لڑکے کے لئے سخت حوصلہ شکن ہوتا اور وہ بڑی الجھن میں پڑ جاتا لیکن بعد میں اسے ہمدردی اور استحسان کے جذبہ سے یاد کرتا۔ غور و فکر اور مشوروں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہتا مگر ان کا دائرہ بہت محدود رہتا۔ صرف دو قسم کے کھانوں میں سے انتخاب کرنا ہوتا۔ صرف دو قسم کے۔ آلو گوشت، پیاز اور ٹماٹر کا سٹو پا ہڈی کے گودے، گوشت پیاز اور ٹماٹر کا سٹو اور ساتھ میں کچھ مٹر۔ وہ ہر چیز کی مقدار طے کرتے اس کی قیمت کا تعین کرتے پھر ہر ایک اپنے حصہ کی رقم ادا کرتا اور اس سے بزرگ شخص مستثنیٰ تھا۔ جب مطلوبہ رقم اکٹھی ہو جاتی تو ان میں سے ایک بازار سے چیزیں خرید لاتا۔ اس کے آنے پر ایک آگ جلانے میں مصروف ہو جاتا جس کے لئے کوئلے دہکائے جاتے۔ جونہی کوئلے جلنے لگتے وہ کھانا بنانے لگتا دوسرے ساتھی ایک ایک کر کے یا ٹولیوں میں اس کا جائزہ لیتے رہتے اور بزرگ شخص ہدایات دیتا رہتا۔ جب کھانا تیار ہو جاتا تو پکانے والا اسے ہلکی آنچ پر دم ہونے کے لئے رکھ دیتا۔ دوسرے یا تو بزروگ کے گرد خوش گپیوں کے لئے جمع ہو جاتے یا کسی اور کام میں لگ جاتے۔ کھانا بنانے والا وقفہ وقفہ کے بعد اس کا جائزہ لیتا کہ کہیں کھانا جل نہ جائے اور کبھی کبھی پانی ڈالتا رہتا۔ کھانا پکنے کے دوران بڑی اشتہا انگیز خوشبوئیں آتی رہتیں۔ ظاہر ہے کہ وہاں صرف وہی لوگ کھانا بنانے میں مصروف نہ ہوتے۔ طالب علموں کے دوسرے گروہ بھی ایسے ہی کھانے بناتے اور ایسی ہی خوشبوئیں سونگھتے۔ البتہ ایسے طلباء بھی تھے جو قطعی طور پر کبھی خود کھانا نہ بناتے اور پھر وہ مزدور بھی تھے جو نچلی منزل میں رہتے تھے، جو کبھی اپنے بیوی بچوں کو ایسے کھانے کھلانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو غالباً اس محرومی پر اپنی بیویوں کے طعنے ہی سنتے ہونگے۔ وہ سب

جنہیں یہ عیش میسر نہیں تھا، وہ مزدور ہوں یا طالب علم، انہیں جمعہ کے دن آنے والی یہ خوشبوئیں بھلی لگتی ہونگی اور بری بھی۔کوئلے آہستہ آہستہ اور بڑے انداز کے ساتھ جلتے تھے جن کی وجہ سے ہمارے دوستوں کا اشتیاق بڑھتا جاتا اور دوسروں کا کرب۔کھانا عصر کے وقت تک ہی تیار ہوتا جب کہ سورج ڈھلنے لگتا تھا۔سب بڑی پھرتی سے میز کے گرد جمع ہو جاتے۔کچھ سنجیدہ سے کچھ مسخرے سے۔ہر ایک اپنا پورا حصہ لیتا اور کسی کو کوئی گڑ بڑ نہ کرنے دیتا اور خود بڑی عیاری سے ہاتھ مارتا رہتا۔البتہ بزرگ شخص وہاں موجود ہوتا اور اس کی خوش مذاقی سے چور نگاہوں میں کچھ شرم آ جاتی۔وہ سب پر نظر رکھتا اور کھانے کی منصفانہ تقسیم کرتا۔جو اپنے حصہ سے زیادہ مانگتا وہ اس کی کھچائی کرتا۔بے جھجک اور بے دریغ اپنے مخصوص پھکڑ پن سے کبھی اسے ٹوکتا کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہا ہے اور اپنے حصہ سے زیادہ لے رہا ہے اور کبھی اسے کہ وہ اپنے آپ کو یا اپنے کسی دوست کو نواز رہا ہے۔یہ الزامات اس خوش مذاقی سے لگائے جاتے کہ کسی کو خجالت محسوس نہ ہوتی اور سب بڑے مزے لے لے کر ہنستے رہتے۔

اس شغل میلہ میں لڑکا بہت پریشان ہو جاتا۔اس کا ہاتھ اس بے ڈھنگے طریقہ سے میز پر بڑھتا کہ نہ وہ کوئی چیز لے سکتا نہ چمچہ کو صحیح طور پر کسی قاب میں ڈال سکتا اور نہ ہی ڈھنگ سے کوئی لقمہ لے سکتا۔اسے لگتا کہ سب کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی ہیں اور وہ بزرگ اس کا ہاتھ کانپنے لگتا اور شوربا اس کے کپڑوں پر گر جاتا۔اسے سخت کوفت ہوتی لیکن وہ خود کو بے بس محسوس کرتا۔غالباً بلکہ یقیناً۔دوسرے سب اس قدر مصروف ہوتے کہ کوئی اس کی طرف خیال بھی نہ کرتا۔اس کا واضح ثبوت تھا کہ وہ اب اس کی طرف متوجہ ہوتے اور جو چیزیں اس سے دور رکھی ہوتیں اس کو پیش کرتے اور کھانے پر اصرار کرتے لیکن وہ اس توجہ سے اور الجھ جاتا۔اس طرح یہ پر رونق دعوتیں جو اس کے لئے خوشی کا باعث ہونا چاہئے تھیں دکھ اور افسوس کا سبب بنتیں لیکن نہیں۔یہ کرب بھی اس وقت خوشی اور اطمینان میں تبدیل ہو جاتا جب وہ چائے کے بعد کام کرنے یا گپ شپ کرنے چلے جاتے اور وہ تنہائی میں ان کی باتیں یاد کرتا کبھی کبھی اچانک اسے محسوس ہوتا کہ وہ واقعی ہنس رہا ہے۔

ان طالب علموں نے کئی سال اس بزرگ کی صحبت میں گزارے اور چچا حاجی علی کی مہربانی سے تمام مشکلوں محرومیوں اور مایوسیوں کے باوجود لڑکا ہنسی خوشی کے ماحول میں

MashalBooks.org

پروان چڑھتا رہا۔

پھر یہ چھوٹا سا گروہ منتشر ہوگیا۔ ہر نوجوان اپنے راستہ پر ہولیا اور اس جگہ کو چھوڑ کر شہر کے کسی اور علاقہ میں رہنے لگا۔ بزرگ سے وہ بہت کم ملنے آتے اور آخرکار یہ ملاقاتیں ختم ہوگئیں۔ لگتا تھا کہ وہ اسے بھول گئے ہیں اور وہ واقعی اسے بھول گئے تھے۔

پھر ایک روز ان میں کچھ کو یہ خبر ملی کہ بوڑھے شخص کا انتقال ہوگیا ہے۔ واقعی انہیں بہت دکھ ہوا۔لیکن انہوں نے اس کا بہت کم اظہار کیا ان کے رخساروں پر اور آنکھوں میں اس دکھ کے آثار باقی نہ رہے۔ جو خبر لے کر آیا تھا وہ بستر مرگ پر اس کے پاس تھا اور اس نے بتایا کہ مرتے دم بوڑھے نے لڑکے کے بھائی کے لئے دعا کی۔ خدا چچا حاجی علی کی روح کو سکون بخشے۔ جسے لڑکا شروع شروع میں قطعی پسند نہیں کرتا تھا لیکن آنے والے برسوں میں جس کی یاد اسے تڑپائے بغیر نہ رہتی۔

۷

ان کی تفریح اور خوشی کا دارو مدار صرف بوڑھے پر ہی نہیں تھا۔ عمارت کے دوسرے حصے میں رہنے والا ایک شخص بھی کچھ عرصہ کے لئے ان کی تفریح کا باعث بنتا۔ وہ ادھیر عمر کا آدمی تھا۔ یقیناً چالیس برس سے اوپر تھا مگر ابھی پچاس کا نہیں ہوا تھا۔ وہ اظہر میں بیس سال تک زیر تعلیم رہا تھا لیکن ابھی اسے سند نہیں ملی تھی۔ گو اب بھی وہ اس سے نا امید نہیں تھا۔ بات یہ تھی کہ نہ تو یہ اس کا مقصد حیات تھا نہ اس نے تمام تر توجہ اس پر مرکوز کر دی تھی بلکہ اس کے علاوہ اس کے دوسرے مشاغل بھی تھے۔

اس کی بیوی اور بچے بھی تھے جن کے لئے اس نے گرما کی تعطیلات وقف کر دی تھیں۔ یہ رمضان کا زمانہ تھا اور کبھی کبھی دوسرے چھوٹے چھوٹے وقفے بھی آتے تھے۔ اس کا خاندان قاہرہ کے قریب ایک گاؤں میں مقیم تھا اور اس نے وہاں آنے جانے میں زیادہ پیسہ یا وقت نہیں لگتا تھا۔ ضلع کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کے پاس بھی تھوڑی بہت زمین تھی اور اس نے اپنے ہی جیسے طبقہ کی عورت سے شادی کی تھی .... وہ کسی بھی طرح مفلوک الحال نہیں تھا گو وہ امیر بھی نہیں تھا لیکن وہ لالچ کی حد تک کنجوس تھا۔

پڑھائی میں اس کی دلچسپی معمولی تھی اور وہ کچھ زیادہ محنت بھی نہیں کرتا تھا۔ درس میں اس کی حاضریاں بہت کم ہوتیں اور اس کی ذہانت نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر بھی وہ خود کو ذہین سمجھتا تھا بلکہ قابل رحم بھی محسوس کرتا تھا۔ یہ نہیں ہیں تھا کہ ممتحن اس کے ساتھ انصاف نہیں کرتے تھے بلکہ اظہر میں بیس برس گزارنے کے بعد بھی اس نے کبھی کوئی امتحان نہیں دیا تھا۔ حالانکہ بارہ برس بعد اسے امتحان دے دینا چاہئے تھا۔ بات یہ تھی کہ اظہر کے متعلق وہ سخت سنکی تھا اور ہر چیز پر شک کرتا تھا۔

طالب علموں کے متعلق اس کی رائے بہت خراب تھی۔ اسے یقین تھا، خواہ یہ یقین صحیح ہو یا غلط اور غالباً غلط ہی تھا کہ اظہر میں ڈگریاں ذہانت یا قابلیت کی بنیاد پر نہیں ملتی تھیں اور نہ ہی محنت یا حقیقی استعداد پر، بلکہ اس کا دارومدار یا خالصتاً قسمت پر ہوتا تھا یا ممتحنوں کی عنایات حاصل کرنے کی اہلیت پر وہ خود کو بدقسمت سمجھتا تھا۔ قسمت جو کسی نا معلوم وجہ سے اسکے خلاف ہو گئی تھی چونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے امتحان دیا تو ناکامی اس کا مقدر ہو گی اس لئے بہتر تھا کہ وہ امتحان ہی نہ دے۔

اس نے اظہر میں اپنا پہلا سال امتحان کی تیاری کے پکے ارادے سے شروع کیا اور دوستوں کے ایک حلقہ میں اس نے مقررہ نصاب کے مطالعہ کے لئے انتظامات بھی کر لئے لیکن ابھی ایک دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے محسوس کیا کہ قسمت اس کے ساتھ نہیں ہے۔ پڑھائی سے متعلق اس کی سب دلچسپی اور ہمت ختم ہو گئی اور وہ اپنی ایک اور دلچسپی کی طرف راغب ہو گیا۔ اس نے خود کو یقین دلا لیا کہ قسمت نے ایک بار پھر اسے ان چیزوں سے محروم رکھا ہے جن سے اس کے بہت سے دوستوں کو نوازا ہے۔ اس لئے کہ یا تو ان کی سماجی حیثیت ایسی تھی یا وہ اتنے ذہین تھے کہ مدرسہ کے شیخ ان سے متاثر ہو گئے تھے۔ چنانچہ گو کہ وہ ان سے کچھ کم ذہین نہیں تھا اور محنت کرنے میں بھی ان سے پیچھے نہیں تھا، وہ ہمیشہ پاس ہو جاتے تھے اور یہ فیل ہو جاتا تھا۔

اپنے ساتھی طلباء سے اکثر وہ یہ کہتا تھا کہ اسے ڈگری حاصل کرنے کے ایسے طریقہ آتے ہیں جو کبھی ناکام نہیں ہو سکتے اور وہ یقیناً ڈگری حاصل کر بھی لیتا اگر اسے زمین کا ایک آدھ ٹکڑا بیچ دینے میں تامل نہ ہوتا حالانکہ اگر اسے ڈگری مل جاتی تو صرف اسے حکیم کا لقب حاصل ہو جاتا بلکہ اس کا راشن بھی بڑھ جاتا اور ہر ماہ 75 قرش بھی اسے ملنے لگتے۔

چنانچہ وہ اچھے دنوں کا انتظار کر رہا اس امید میں کہ قسمت اس پر مسکرائے گی جیسے وہ اسی کے گاؤں کے ایک لڑکے پر گزشتہ برس مہربان ہوئی تھی۔ یہ لڑکا پچیس سال تک زیر تعلیم رہا تھا، حالانکہ وہ بہت ہوشیار اور سمجھدار تھا۔ پھر ایک خوش قسمت دن وہ امتحان میں بیٹھ گیا۔ وہ صرف پاس ہی نہیں ہوا بلکہ تین میں سے اسے دوسرا درجہ دے دیا گیا اور اگر کمیشن کے ایک رکن سے اس کے بہتر تعلقات ہوتے تو اسے اول درجہ بھی مل جاتا۔

اس لئے بہتر یہی تھا کہ انتظار کیا جائے جیسے اس کے دوست نے انتظار کیا تھا۔ پھر شاید اس پر بھی قسمت اسی طرح مہربان ہو جائے۔ ''دوستو!'' اس نے کہا ''یہ سب مقدر کی بات ہے۔ میں نے تمہاری ہی طرح پڑھا ہے۔تمہاری ہی طرح کام کیا ہے۔ پھر میں دعا کرتا ہوں کہ تمہارے نصیب مجھ سے بہتر ہوں۔ مجھے کوئی امید نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ہوس۔''

وہ نوجوان بڑے غور سے یہ سب کچھ سنتے۔ اسے ذہن میں صرف محفوظ ہی نہ کرتے بلکہ اس کے عجیب وغریب انداز بیان سے متاثر ہوتے۔ اس لئے کہ وہ عجیب سے دھیمی آواز میں بولتا تھا جیسے سرگوشی کرر ہا ہو۔ ایک ایک لفظ پر یوں زور دیتے ہوئے جیسے وہ سننے والوں کے کانوں پر سوار ہونا چاہتا ہو۔ وہ باتوں باتوں میں قصے چٹکلے اور لطیفے سناتا رہتا اور ان میں اسے بہت ہی مزہ آتا۔ یہاں تک کہ وہ آپ ہی آپ ہنستا۔ دوسروں کو شروع شروع میں ہنسی کی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی لیکن وہ کوئی پرواہ کئے بغیر ہنستا چلا جاتا۔ یہاں تک کہ اسکی پسلیاں دکھنے لگتیں۔ آخر وہ بھی ہنسنے لگتے۔ اس کی ہنسی بڑی غیر معمولی تھی، پہلے بڑی تیز سی ''فو'' کی سی آواز نکلتی، رکتی اور پھر ایک لمحہ کے لئے دھیمے دھیمے اٹھتی، حتیٰ کہ بڑے زور سے پھٹ پڑتی اور پھر یہ عمل دوبارہ شروع ہو جاتا۔

اکثر جب ان سب کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہوتا تو یہ طلباء اس کے پھکڑ پن کو دہراتے اور اسکی عجیب سی ہنسی کی نقل اتارتے۔

لیکن اس کی جس بات سے وہ بہت متاثر تھے وہ کوئی اور ہی تھی۔ وہ عیش پسند تھا اور اسے عیاشی کی لت تھی۔ وہ اپنی رنگ رلیوں کا ذکر بڑے مزے لے لے کر کرتا اور باتوں میں بھی اسے رنگ رلیوں سے زیادہ لطف آتا تھا۔ اس کی لذت کشی کو ایک عیب اور کسی حد تک ایک مجرمانہ حرکت بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ وہ بیوی کے ساتھ اپنے بہت ہی نجی قسم کے تعلقات بیان کرتا اور بڑی ناگوار تفصیلات کے ساتھ اور بیچ بیچ میں بے ہنگم سے قہقہے لگاتا رہتا۔ یا وہ ان مرغن کھانوں کے مزے یاد کرتا جو اس نے گاؤں میں کھائے تھے یا کبھی اس گھٹیا کھانے کے مزے جو شہر میں ملتے تھے۔ اس دوران کبھی وہ کوئی لطیفہ سناتا اور کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔

پھر وہ بڑے اشتیاق سے ان مناظر کو یاد کرتا جو اس نے شہر کے گلی کوچوں میں

دیکھے تھے یا گھر میں تازہ ہوا لینے کے لئے ٹھہر جاتا اور نیچے کی منزل میں ہونے والے واقعات کا جائزہ لیتا۔ گھر میں یا باہر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی عورت سے اس کی مڈ بھیڑ ہوئی ہو اور اس نے اسے سر سے پاؤں تک غور سے نہ دیکھا ہو اور اپنے تخیل میں تو وہ اسے ننگی ہی نظر آتی تھی۔ اس غیر اخلاقی عادت سے اسے کوئی احساس گناہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ عورت کے متعلق ایک انسان کی حیثیت سے بات نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اس کے لئے وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا تھا جو عام طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ مثلاً وہ یہ کہتا ''کیا کولھے ہیں!'' پتلی دبلی عورت میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے مطابق عورت کو گداز جسم اور دراز قد ہونا چاہئے تھا اور اسکے کولہے ایسے فربہ ہونا چاہئے تھے جیسے تکیہ یا گدہ۔

اپنے اس ذوق کی حمایت میں وہ کعب ابن زہیر کا اپنی محبوبہ سعاد کے لئے یہ شعر پیش کرتا۔

سامنے سے وہ پتلی لگتی ہے مگر پیچھے سے ہے کتنی سڈول
نہ پستہ قد ہے اس کا نہ قامت ہے اس کی طویل

وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا ''آپ دیکھتے نہیں کہ وہ صرف سامنے سے اس کی پتلے پن کی بات کرتا ہے تاکہ کہہ سکے کہ پیچھے سے کتنی بڑی لگتی ہے۔'' پھر وہ ناگوار تفصیلات میں چلا جاتا جن میں فحش مذاق اور قصے بھی شامل ہوتے اور ساتھ ہی ساتھ وہ قہقہے بھی لگاتا رہتا۔ نوجوان ان سے لطف اندوز ہوتے۔ ایسی مجرمانہ یا معصومانہ تفریحات۔ ان کی سمجھ سے باہر تھے اور ان فحش تفصیلات سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔

لڑکا اپنے گوشہ میں دبکا بیٹھا رہتا۔ جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ تاہم وہ ساری باتیں سنتا، کوئی لفظ کوئی بات اس سے چھپی نہ رہتی۔ وہ سوچتا کہ اگر ان لوگوں کو پتہ چل جائے کہ میں کیسے ان کی باتیں سنتا ہوں اور ان سے کس قدر سیکھتا ہوں تو پھر وہ ایک نوعمر لڑکے کے سامنے ایسی باتیں کرنا چھوڑ دیں گے۔

وہ شخص اس زمانے میں واقعات کے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلہ میں الجھا رہا۔ ان واقعات میں بظاہر وہ لطف لیتا تھا مگر دراصل وہ بڑا قابل رحم ہے وہ کسان تھا اور اس میں کسانوں کی تمام کمزوریاں موجود تھیں۔ زمین کا بھوکا، کنجوس اور ہر سودے میں صرف منافع کے متعلق سوچنے والا۔ جب وہ اپنے گاؤں جاتا یا دیہات کے متعلق سوچتا یا

اپنے خاندان کے کسی فرد سے ملتا تو اس کے دماغ پر پیسہ اور صرف پیسہ چھایا رہتا۔

وہ حقیقی معنوں میں عیش پسند تھا۔ وہ ہنگاموں کی تلاش میں رہتا اور ایسے مزوں کے پیچھے بھاگتا جن میں نہ کوئی نفاست ہوتی نہ شائستگی نہ جذبہ۔ اسے اپنی علمی کاوشوں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی، وہ تو مقاصد کے حصول کا ذریعہ تھیں یا شاید بہت سے مقاصد میں سے کوئی ایک مقصد۔ اس لئے جب وہ پیسہ کمانے سے اکتا جاتا یا عیاشی سے سیر ہو جاتا تو ان کی طرف رخ کرتا۔ وہ عمارت کے دوسرے سرے پر اپنے کمرے میں آ کر ٹھہر جاتا اور اپنے ساتھی طلبا، اساتذہ اور اپنی سند کے متعلق سوچتا۔ پھر کھانے کی میز پر وہ طلباء سے ملتا یا چائے پر ان سے ملاقات کرتا اور اپنے چٹکلوں سے ان کا دل بہلاتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ پکا مسلمان تھا۔ کبھی کبھی اس پر تصوف کے دورے پڑتے اور وہ عیش پرستی سے باز آ جاتا اور پرہیز گار بن جاتا۔ وہ سختی سے اپنا احتساب کرتا اور روزہ اور ریاضت میں منہمک ہو جاتا۔

ایک روز کسی بات پر اپنے سسر سے جھگڑ کر اس نے اپنی دیہاتی بیوی کو چھوڑ دیا اور قاہرہ کے کسی اعلیٰ خاندان میں شادی کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے اسے طلاق دے دی اور اپنی نئی خواہش کے متعلق اپنے دوستوں کو اعتماد میں لینے لگا اور بڑے بھونڈے انداز سے شہری عورتوں کا دیہاتی عورتوں سے موازنہ کرتا۔ پھر ایک روز وہ دولت اور عورت سب کو بھول گیا اور کھانے پینے کی عیاشیوں سے بھی بددل ہو گیا اسے یہ گمان ہوتا تھا کہ اگر وہ امتحان دے تو قسمت اس کی یاوری کرے گی۔ اس میں اسے بالکل شک نہیں تھا۔ اس نے طے کیا کہ فوراً اس مہم کا آغاز کر دے چنانچہ وہ اپنے اساتذہ سے نبٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کے پاس تیاری کے لئے کئی مہینے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو خدا حافظ کہا۔ گپ شپ اور لہو و لعب کو خیر باد کیا اور فقہ، حدیث، گرامر، دینیات اور بنیادی اصولوں پر عبور حاصل کرنے کے لئے کمربستہ ہو گیا۔ مختصر یہ کہ اس نے سارے نصاب کو تیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے بڑی توجہ سے پڑھا اور آخر کار ایک یادگار دن وہ امتحان میں بیٹھ گیا۔

وہ ممتحنوں کے پاس صبح سویرے حاضر ہوا اور شام تک انہیں بھی تھکایا اور خود بھی تھک گیا۔ جب وہ زیادہ سختی کرتے تو اس نے اس سے بچنے کے لئے ایک زبردست

ترکیب سوچی۔ وہ دو تین تربوز لے آتا اور انہیں کمرہ امتحان کے باہر رکھ دیتا۔ جب ممتحن آتے تو وہ ظاہر کرتا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور اسے بار بار پیشاب کے لئے جانا پڑتا ہے۔ ممتحن اس پر رحم کھاتے اور اسے ہر آزادی دے دیتے۔ چنانچہ وہ کسی ممتحن کو جواب دیتے دیتے یا کسی کتاب کو پڑھتے پڑھتے ایک دم سے معذرت چاہتا اور اٹھ کر چلا جاتا۔ پیشاب کرنے نہیں نہ کسی تکلیف کے سبب بلکہ کوئی آدھا تربوز کھانے کے لئے کہ اس کا خیال تھا کہ اس سے اسے فرحت محسوس ہوگی، اس کا ذہن تیز ہوگا اور اسے نئے نئے خیالات سوجھیں گے۔ پھر وہ بورڈ کے سامنے پیش ہوتا اور اپنے جوابات جاری رکھتا سارے دن یونہی ہوتا رہا اور ممتحوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آخر وہ بڑی خوشی خوشی گھر واپس آیا۔ وہ سند حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ گو یہ تیسرے درجہ کی تھی مگر اب اس کا شمار علماء میں ہونے لگا تھا۔

گرمی آتے ہی سب منتشر ہو گئے اور جب وہ موسم خزاں میں اپنے دوستوں سے ملا تو اس کی رہائش کسی اور جگہ تھی۔ قاہرہ کے ایک خاندان میں شادی کی اس کی آرزو پوری ہوگئی تھی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ پرانے گھر کے قریب ہی رہنے لگا تھا۔

پھر ایک روز اس پر پرہیزگاری کا دورہ پڑا اور وہ ایک مسجد میں روزہ اور عبادت کے لئے چلا گیا۔ اپنے منصوبہ کے مطابق نہ جانے وہ کتنے عرصہ تنہائی میں رہا لیکن یہ عرصہ یقیناً کافی طویل تھا۔ اس لئے کہ جب وہ واپس آیا تو سخت لاغر اور کمزور تھا۔ اس کے گھر والوں نے یہ حلیہ دیکھا تو وہ اس سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے اور اس کی مردانگی کا مذاق اڑانے لگے۔ اس سے ایک مرتبہ پھر اس کا گنوار پن جاگ اٹھا اور اس کا ہوس پرست دیہاتی خون کھول اٹھا۔ وہ صبح سویرے کسی قہوہ خانے یا ریستوران میں جانے لگا جہاں وہ سور کی طرح لوبیے، روٹیوں پیاز اور تیل پر پل پڑتا اور پھر اپنی پیاس بجھانے کے لئے چائے پیتا اور پھر اپنے معدہ کے ساتھ وہ کرتا جس کا مہذب لوگ ذکر تک نہیں کرتے۔ یہ سب ہڑپ کر کے بلکہ اپنا ہاضمہ خراب کر کے وہ بڑے غصہ میں گھر جاتا اور خوف اور حقارت کا سامنا کرتا۔ پھر وہ کھڑکی سے چھلانگ لگانے کی کوشش کرتا لیکن گھر والے اسے روک لیتے اور سخت مزاحمت کے بعد اسے قابو میں کر لیتے۔ اس کی عقل جواب دے چکی تھی اور وہ قطعی بولا گیا تھا۔ بالکل پاگل ہوگیا تھا۔

ایک رات مغرب کی نماز کے بعد ایک خوفناک چیخ نے نوجوانوں کو ہیبت زدہ کر دیا۔ اگر ان کی غیرت نہ روکتی تو وہ آنسو بہانے لگتے۔ یہ اس پاگل شخص کی چیخ تھی نشہ کی وجہ سے جس کی زبان بے لگام ہوگئی تھی۔ اگلے روز اس کے گھر والے اسے پاگل خانہ لے گئے۔ وہ کئی ہفتے وہاں رہا اور جب واپس آیا تو پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی تھی تو وہ بہت سست ہوگیا تھا اور اس کی ہنسی غائب ہوگئی تھی۔ ملنے والے اسے دیکھ کر کچھ خوف زدہ ہوجاتے اور کچھ اس پر ترس کھاتے۔

دن اسی طرح گزرتے رہے اور نوجوانوں سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ ہر ایک اپنے اپنے راستہ چل دیا اور وہ بہت کم اس سے ملنے آتے حتیٰ کہ ان کا آنا بالکل بند ہوگیا۔ اس کی خبر تک بھی بہت کم ہی ان تک پہنچتی اور پھر یہ بھی ممکن نہ رہا۔

آخر ایک دن انہوں نے اس کے انتقال کی خبر سنی۔

اس کی موت سے انہیں کچھ صدمہ ہوا لیکن نہ وہ روئے نہ ان کے چہروں پر افسوس کے آثار نظر آئے۔

۸

اس عمارت میں ایک کمرہ اور بھی تھا جہاں کچھ کم شور اور ہنگامہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ سیڑھیوں کے سرے کے قریب اور بائیں طرف کو تھا۔ اس میں ایک نوجوان رہتا تھا جو غالباً ہمارے دوستوں سے عمر میں کچھ بڑا تھا۔ اظہر میں وہ یقیناً وہ پڑھائی میں ان سے آگے تھا۔ گو وہ انہی کی نسل اور انہی کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی چھوٹی سی چیں چیں کرتی ہوئی آواز سن کر کوئی ہنسی ضبط نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اتنا کند ذہن تھا کہ کوئی بات اس کے دماغ میں بیٹھتی ہی نہیں تھی اور کسی چیز کی ذرا بھی گہرائی تک جانے کی اس میں قطعی اہلیت نہیں تھی۔ تاہم وہ خود کو بہت کچھ سمجھتا تھا اور اسکے ارادوں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ اسے پکا یقین تھا کہ اس میں اور اس کے ساتھ رہنے والوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔

یہ نہیں کہ وہ ہر درس میں حاضر ہوتا۔ وہ فقہہ اور بلاغت اور امام کے درس میں جاتا لیکن بنیادی اصولوں کے درس میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی جس کے لئے بہت سویرے اٹھنا پڑتا تھا۔ نیند اسے بہت عزیز تھی اور وہ اسے خراب نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے دوستوں کے مطالعہ میں شریک ہونے سے کبھی کوتاہی نہ کرتا اور نہ اس تحقیقی کام سے جس کا نصاب و کتب سے کوئی تعلق نہ تھا جن پر شیخ درس دیتے تھے۔

یہ نوجوان اظہر میں پڑھائے جانے والی کتابوں اور وہاں کے طرز تعلیم پر سخت تنقید کرتے تھے۔ اس میں وہ امام کی پیروی کرتے تھے جو اپنے درس اور ملاقاتوں میں گرامر، بلاغت، دینیات، حتیٰ کہ ادب پر بھی بڑی اعلیٰ کتابوں کے حوالہ دیتا تھا۔ ان کی اہمیت کے باوجود شیوخ ان تمام کتابوں کو رد کرتے تھے اس لئے کہ انہوں نے یہ پڑھی ہی

MashalBooks.org

نہیں تھیں اور چونکہ امام نے ان کی سفارش کی تھی اس وجہ سے وہ اور بھی ناپسند کی جاتی تھیں۔ البتہ چند لائق اساتذہ امام کے نقش قدم پر چلنے کے خواہش مند تھے اور ان اہم کتابوں کے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے جو اظہر میں نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس لئے کہ وہ وہاں تھیں ہی نہیں۔ جونہی ہمارے دوستوں کو ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ لگتی وہ فوراً اسے خریدنے کی کوشش کرتے۔ پیسے نہ بھی ہوتے تو وہ تکلیفیں سہہ کر اپنے اوپر جبر کر کے اسے خریدتے۔ بصورت دیگر وہ اظہر کی لائبریری سے یہ کتاب حاصل کر لیتے اور بڑی لگن سے اس کی ورق گردانی کے بعد سب مل کر اسے پڑھنے کا اہتمام کرتے اور اس کو سمجھنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہ امام کا سخت احترام کرتے تھے اور دوسرے انہیں علم حاصل کرنے کی لگن بھی تھی۔ پھر اسکے علاوہ علمی تفاخر بھی اس کا ایک سبب تھا۔ انہیں شیخ بخیت۔ شیخ ابوخطوہ اور شیخ راضی کے شاگرد ہونے پر فخر تھا۔ وہ صرف ان کے پاس درس میں ہی شامل نہ ہوتے بلکہ ان کے گھروں پر بھی حاضری دیتے۔ جمعرات کے دن عصر یا مغرب کی نماز کے بعد وہ ان سے پرائیویٹ درس لیتے یا ان کی تحقیقات میں مدد دیتے۔ ان کے ہم جماعت اگر ان سب باتوں سے واقف ہو جاتے یا ان کے زیر مطالعہ غیر معمولی کتابوں پر کوئی تبصرہ کرتے بھی تو انہیں ناگوار نہ گزرتا۔ اس طرح انہیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی اور وہ بہت اچھے طالب علم سمجھے جانے لگے جس سے ان کا شاندار مستقبل مستحکم ہوگیا یہ فطری بات تھی کہ کم لائق طالب علم ان کی صحت کے متلاشی رہنے لگے۔ ہمارا دوست بھی انہی دوسرے درجہ کے طالب علموں میں سے تھا۔ اس نے بھی خود کو اس گروہ سے وابستہ کرلیا تاکہ اس کو بھی انہی میں سے سمجھا جائے اور یوں وہ ان کے ساتھ امام شیخ بخیت سے بھی ملاقاتیں کرسکتا تھا۔ بیشک یہ بھی ان نوجوانوں کے لئے ایک فخر کی بات تھی کہ وہ اپنی امتیازی حیثیت کا فائدہ اٹھائیں اور ایسے خوشہ چینوں کو اپنے ساتھ رکھیں لیکن وہ ان کی حماقتوں کو کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ جب وہ آپس میں مل کر بیٹھتے تو انکی احمقانہ غلطیوں پر اتنا ہنستے کہ ان کے پیٹ میں درد ہونے لگتا۔ غالباً کسی درس میں ہمارے دوست کی ان سے ملاقات ہوگئی اور وہ ان سے قریب ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ ان کی رہائش گاہ پر گیا جو اسے بہت پسند آئی اور اس نے سوچا کہ وہاں رہنا کتنا اچھا ہو گا۔ چنانچہ اس نے وہیں ایک کمرہ لے لیا اور خود کو اس گروہ سے منسلک کرلیا۔ وہ ان کے

MashalBooks.org

ساتھ درس میں شریک ہوتا۔ چاہئے پیتا ان کے ساتھ ملاقاتوں پر جاتا بلکہ کسی حد تک ان کی شہرت میں بھی شریک ہو گیا لیکن ان کا علم۔ ان کی ذہانت اور ان کی روشن دماغی۔ افسوس یہ اس کے حصہ میں نہیں آئیں۔

اس کی مالی حالت غالباً دوسروں سے بہتر رہی ہوگی یا پھر شاید اپنے معاملہ میں کنجوسی سے وہ اتنا کچھ بچا لیتا تھا کہ دوسروں کے ساتھ ہوتا تو وہ بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتا اور ان پر یہ تاثر قائم ہوتا کہ وہ خاصا خوش حال ہے۔ کبھی وہ دیکھتا کہ ان کے پاس کسی کتاب خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں یا کسی کا قرضہ اتارنا ہے اور یا کوئی فوری ضرورت آ پڑتی ہے تو وہ بڑے دوستانہ انداز میں اور بڑے کھلے دل سے ان کی مدد پر اصرار کرتا۔ اس طرح وہ اس کے ممنون و معترف ہو گئے تاہم اس کی حماقتوں کو وہ کم نہ کر سکے اکثر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پاتے اور اس کے منہ پر ہی اس کا مذاق اڑاتے۔ اس پر ہنستے اور یہ تاثر بھی نہ چھپا سکے کہ وہ اسے کتنا حقیر سمجھتے تھے۔ لڑکے نے یہ سب کچھ خوشی سے بلکہ ہنستے ہوئے برداشت کیا۔ انہیں بمشکل ہی کبھی اسکے چہرے پر ناراضگی کے آثار نظر آئے ہونگے۔ ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ گرامر کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا اور ایک بھی مثال دینے سے قاصر تھا حالانکہ گرامر کی کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں لیکن اگر کہیں سے اسے کوئی مثال مل جاتی تو وہ اسے یاد کئے بغیر نہ رہتا۔ اسکے جواب میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اس لئے کہ خواہ کیسی ہی الجھی ہوئی بحر ہو وہ اسکی تشریح اسی سادہ بحر میں کر دیتا جو اسے آتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ بحر کی اس طرح نشاندہی سے وہ مطمئن بھی نہیں تھا بلکہ وہ شعر کا پورا پورا تجزیہ کرتا وہ سب اس پر بہت ہنستے اور اسکے لئے پڑھنا دوبھر کر دیتے۔ یہ اتنی کثرت سے ہوتا تھا کہ اکثر کہتے کہ انہیں بحر کا پتہ نہیں ہے۔ اسے البتہ شعر کو اسی ایک بحر میں ڈھالنے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ وہ یہ تاثر دینے کہ تقطیع کی کوشش کر رہے ہیں اور آخر کار اسی کی وحد بحر کو صحیح قرار دیتے۔ ایک بار پھر قہقہے بلند ہوتے لیکن وہ ناراض ہوتا نہ غصہ کرتا۔ ویسے ہی سادگی سے مسکراتا رہتا۔

یہ نوجوان برسوں ان کے ساتھ رہا اور اس نے کبھی غصہ کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن آخر کار اسے احساس ہو گیا کہ وہ ان کی ٹکر کا نہیں تھا اور نہ ان کے ساتھ تعلیم جاری رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے درس سے غیر حاضر ہونا شروع کر دیا اور اسی طرح مختلف بہانوں سے

ان کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا بھی بند کر دیا۔ وہ ان کی صحبت پر قانع تھا اور کبھی کبھی ان کے ساتھ چائے پی لیتا۔ کھانا کھاتا یا ملاقاتوں پر جاتا۔

اسی دوران لڑکا سیانا ہو گیا اور اس کے کام میں بہتری آ گئی۔ نوجوان (بھائی) اب اس سے لحاظ اور عزت سے پیش آنے لگا اور ایک روز اس نے تجویز پیش کی کہ وہ دونوں مل کر کام کریں۔ اصل میں وہ اپنے ہم عصر اور ہم مرتبہ دوستوں کے بجائے ایک لڑکے سے تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ لڑکا اس کے ساتھ منطق۔ دینیات اور حدیث کی کتابیں پڑھنے لگا۔ لیکن اس سے اس کے اپنے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ چونکہ وہ نہ اس پر ہنستا تھا نہ اس کا مذاق اڑانا چاہتا تھا بلکہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا اس لئے اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اکیلے ہی اپنی تعلیم جاری رکھے۔

چنانچہ اس نوجوان نے پڑھنا چھوڑ دیا بلکہ یوں کہیئے کہ پڑھائی نے اسے چھوڑ دیا لیکن اظہر میں اس کا نام طلباء میں شامل رہا اور وہ اپنے دوستوں کی مجلسی زندگی میں حصہ لیتا رہا۔ اپنی ذہانت اور سمجھ کی وجہ سے وہ اب دنیا میں ترقی کرنے لگے تھے جس میں امام کی مہربانی اور دلچسپی کو بھی دخل تھا۔ انہوں نے اچھے گھرانوں کے دو ایک نوجوانوں سے دوستی کر لی تھی جو اظہر میں زیر تعلیم تھے۔ وہ ان لوگوں کے ہاں آنے جانے لگے۔ اس میں ہمارا دوست بھی شامل ہوتا اور جیسے جیسے ان کی سماجی حیثیت بڑھتی گئی یہ بھی معتبر ہوتا گیا۔ دوسروں کو اس کی ترقی کا علم نہیں تھا اور وہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ کبھی یہ ڈینگیں نہیں مارتے تھے کہ بڑے بڑے لوگوں میں جاتے ہیں اور بڑے لوگوں سے ملتے ہیں۔ یہ ان کے لئے عام سی بات ہو گئی تھی لیکن ان کا دوست یوں محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ ان سب چیزوں سے سخت مرعوب تھا اور ان تعلقات پر بڑا فخر محسوس کرتا تھا اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ کبھی کبھی وہ ان سے کوئی مادی فائدہ بھی حاصل کر لیتا۔ بہر حال وہ اس کے متعلق بات کرتے نہ تھکتا۔

دن گزرتے گئے اور ان طالب علموں نے دنیا میں قدم رکھا اور سب اپنے اپنے راستہ چلے گئے لیکن ہمارا دوست انہیں کبھی نہ بھولا اور نہ انہیں موقع دیا کہ وہ اس کو بھلا دیں۔ وہ پڑھائی میں ان کا ساتھ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن کوئی وجہ نہیں تھی کہ زندگی کے دوسرے مشاغل میں ان کے ساتھ نہ رہے۔ وہ اس سے ملیں نہ ملیں یہ ان سے

MashalBooks.org

ملتا رہتا اور جب وہ اپنے امیر اور ممتاز دوستوں سے ملنے جاتے تو یہ بھی ساتھ جاتا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی جبر کے تحت امام کو اظہر سے ریٹائر ہونا پڑا۔ عجیب بات تھی کہ ہمارے دوست کو امام اور اس کے خاص شاگردوں سے عقیدت کے ساتھ ساتھ فریق مخالف سے بھی قربت حاصل تھی۔ اظہر میں کچھ ایسے سیاسی ہنگامے شروع ہوئے کہ لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ یہ شخص احتجاج کرنے والوں کے ساتھ تھا مگر ان کے دشمنوں سے بھی ملتا تھا اور ان کے راز وہاں پہنچاتا تھا۔ ایک دن اسے خمیازہ بھگتنا پڑا اور وہ بھی کیا دن تھا جب وہ پولیس سے رابطہ کرتے ہوئے پکڑا گیا اسکے پرانے دوستوں نے اس سے تعلقات منقطع کر لئے اور ان کے گھروں کے دروازے اس پر بند ہو گئے وہ اپنے کمرے میں عمرات کی آخری منزل پر بے یار و تنہا رہ گیا۔ اظہر سے سند لینے کی اس کی آرزو پوری نہیں ہوئی اور اب اسے نظر آ رہا تھا کہ اس کی زندگی تنہائی اور ذلت میں گزرے گی اور وہ اس بے عزتی کو جہاں تک ہو سکے برداشت کرتا رہے گا۔

پھر ایک دن خبر آئی کہ وہ مر گیا۔ کیا اس کی وجہ بیماری تھی۔ غربت تھی یا یہ تھی کہ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا؟ یہ کوئی نہ جان سکا۔ لیکن اس کے دوستوں کو اس کی موت پر کوئی دکھ یا افسوس نہیں ہوا۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔ انا للّٰہ و انا للّٰہ راجعون.

MashalBooks.org

۹

جب لڑکا پہلی مرتبہ وہاں آیا تھا تو وہ جگہ تقریباً خالی تھی۔ رمضان کی چھٹیاں ختم ہوئی تھیں اور لوگ ابھی واپس نہیں آئے تھے۔ اس بات سے لڑکے کو پتہ لگا تھا کہ طالب علم قاہرہ آنے میں دیر کرتے تھے۔ اس بات سے لڑکے کو پتہ لگا تھا کہ طالب علم قاہرہ آنے میں دیر کرتے تھے۔ خصوصاً ان چھٹیوں کے بعد۔ جب کہ تعلیمی سال شروع ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ طلباء اور شیوخ کو اپنے گھر چھوڑتے ہوئے دکھ ہوتا ہے اور وہ دو تین دن چھٹی بڑھا لیتے تھے اور کبھی ایک دو ہفتہ بھی یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں تھی۔ اس لئے کہ یہ اظہر کا وہ روشن دور تھا جب کام اور آرام کے اوقات سختی سے متعین نہیں تھے۔ نہ طلباء کے لئے اور نہ اساتذہ کے لئے روزانہ حاضری کے لئے کوئی سخت نظام الاوقات نہیں تھا۔ ہر چیز میں لچک اور سہولت تھی۔ ناظم جامعہ سرکاری طور پر یونیورسٹی کے کھلنے کا ایک دن مقرر کر دیتا تھا لیکن اساتذہ کی مرضی تھی کہ جب چاہیں تدریس شروع کریں اور طالب علم بھی اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق پڑھائی شروع کرتے۔

اس زمانے میں ضابطے نرم تھے۔ ان کا انحصار اور قانون کے بجائے رضا و رغبت پر تھا۔ ان کا مقصد بھیڑوں کو بکریوں سے الگ کرنا تھا اور طلباء کو صرف علم کی خاطر پڑھنے کی ترغیب دی جاتی تھی سزا اور جزا کے لئے نہیں۔

شیوخ اور طلباء دونوں ہی آزادی اور چشم پوشی کی فضاء میں بہت خوش تھے گو ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ اس رعایت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ پہلے دو ہفتوں میں ہر ایک کو چھٹی تھی کہ جو چاہے کرے اور زیادہ تر یہ زمانہ دوستوں سے ملنے اور نئے دوست

MashalBooks.org

بنانے میں گزرتا تھا۔طلباء آہستہ آہستہ اپنے گھروں سے آتے رہتے ایک دوسرے سے ملتے اور پھر اطمینان سے پڑھائی کی طرف متوجہ ہوتے۔اساتذہ کو بھی گھروں سے واپس آنے میں کوئی عجلت نہیں تھی۔ وہ قاہرہ میں طویل قیام کے لئے بندوبست کر دیتے۔ ملاقاتیں کرتے اور بغیر کسی پس و پیش کے سکون کے ساتھ تدریس شروع کر دیتے۔البتہ اساتذہ اور طلباء دونوں میں ہی کچھ ایسے بھی تھے جو گھروں اور دوستوں سے زیادہ تعلیم کو اہمیت دیتے تھے۔کچھ چھٹیوں کے دوران قاہرہ میں ہی ٹھہرے رہتے۔اظہر میں ہی اپنے کمروں میں مطالعہ کرتے یا کسی مسجد میں ٹھہر جاتے۔دوسرے جونہی موقع ملتا قاہرہ لوٹ آتے کہ شاید انہیں نجی طور پر کچھ درس لینے کا موقع مل جائے۔

یہی سب وجوہات تھیں کہ جب لڑکا اور اس کا بھائی وہاں پہنچے تو ساری جگہ تقریباً خالی تھی۔سوائے چچا حاجی علی،نوجوان شیخ کے دوستوں اور دو ایرانیوں کے وہاں کوئی نہیں تھا۔لیکن لڑکے کے وہاں پہنچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد لوگ آنا شروع ہو گئے۔کبھی اکیلے،کبھی گرہوں میں،کبھی صبح،کبھی شام،جلد ہی ساری جگہ شور و غل اور ہنگامہ سے بھر گئی اور لگتا تھا کہ جیسے یہ ابھی پھٹ پڑے گی۔

وہ وہاں بیٹھتے کیسے تھے۔پڑھتے کیسے تھے۔سوتے کیسے تھے؟ لڑکا خود سے یہ سوالات کرتا اور کوئی جواب نہ پاتا۔البتہ یہ اسے معلوم تھا کہ کمرہ کا کرایہ بمشکل ہی 25 پیاسٹر ماہانہ تھا بلکہ بیس بھی ہوسکتا تھا۔اس طرح ایک طالب علم کو مہینہ میں صرف ایک پیاسٹر ہی کرایہ دینا پڑتا تھا۔

اس سے ان دیہاتی بچوں کی حالت کا اندازہ ہوسکتا ہے جو جوق در جوق دینی تعلیم کے حصول کے لئے قاہرہ آتے تھے اور اظہر میں داخلہ لیتے تھے۔وہ اپنی استعداد کے مطابق دینی تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہاں سے بہت بیماریاں بھی لے جاتے تھے۔جسمانی،اخلاقی،حتیٰ کہ ذہنی بھی۔

پہلے ہفتہ میں لڑکے کے دائیں جانب کا کمرہ خالی رہا۔یہاں نہ کوئی حرکت ہوئی نہ آواز آئی۔ پہلے کے بعد دوسرا ہفتہ آیا لیکن کوئی ہل چل نہ کوئی آواز۔ طالب علم ایک دوسرے سے پوچھتے رہے کہ رمضان سے پہلے جو شیخ یہاں رہا تھا اسے کیا ہوا۔کیا وہ یہاں سے کہیں اور منتقل ہو گیا ہے لیکن دوسرے ہفتہ کے دوران ایک رات لڑکا حاجی علی کی آواز

سے جاگ اٹھا جو اندھیرے کو چیرتی ہوئی آ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کی زمین پر لاٹھی مارنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ بدستور حیرانی کے عالم میں وہ موذن کی آواز کا انتظار کرنے لگا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اذان دہراتا رہا۔ آواز بند ہوئی اور لڑکے کا دھیان نمازیوں کی طرف منتقل ہو گیا جو مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ تیز تیز کچھ اونگھتے ہوئے۔ لیکن یہ کیا! یہ کیا ہے! ایک عجیب سے چلاتی ہوئی آواز لڑکے کے سرہانی دیوار کے پیچھے سے آئی جس نے اس کے کان کے پردے پھاڑ دیئے اور وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھا۔ وہ آواز لڑکا کبھی نہیں بھولا اور اب بھی اسے یاد کر کے وہ ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ بڑی عجیب و غریب آواز تھی۔ پہلے وہ اس سے خوف زدہ ہو گیا۔ پھر اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا جسے وہ ضبط نہیں کر سکا حالانکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا بھائی نہ اٹھ جائے۔

ال..........ال..........اللہ اک..........اللہ اک..........اللہ اکبر

یہ وہ آواز تھی۔ شروع کے الفاظ اور درمیان میں جو الفاظ دہرائے جاتے تھے وہ سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن آخری الفاظ واضح تھے۔ تاہم آخر میں آواز بالکل ختم نہیں ہوئی بلکہ کئی ناکام کوششوں کے بعد کچھ صاف ہوتی گئی۔ آخر ہر لفظ اپنے مقام پر آ گیا اور بولنے والے کی زبان سے لڑکے کے کانوں بلکہ دماغ تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد اسی آواز نے سورہ فاتحہ کی تلاوت شروع کی۔ اب لڑکے پر کھلا کہ کوئی نماز پڑھ رہا ہے۔ پھر جب وہ اس آیت تک پہنچا **ایاک معبدو ایاک نستعین** ۔ تو آواز اٹک گئی اس کے بعد اس نے پھر شروع سے۔ ال۔ ال۔ ال۔ اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا۔ اب لڑکے سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ کھل کر ہنس پڑا۔ اس کا بھائی جاگ گیا اور اس سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ لڑکا کوئی جواب نہ دے سکا لیکن جونہی بھائی نے دیوار کے پیچھے سے آنے والی آواز سنی کسی وضاحت کی ضرورت نہ رہی۔ وہ بھی بمشکل ہی اپنی ہنسی ضبط کر سکا۔ اس نے آہستہ سے کہا کہ یہ ہمارا پڑوسی شیخ ہے جو شافعی ہے۔ وہ واپس آ گیا ہے اور نماز ادا کر رہا ہے۔

نوجوان شیخ نیند میں تھا اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا اور دوبارہ سو گیا۔ لڑکے نے بھی خود کو قابو میں کیا۔ وہ شیخ کی آواز کے ساتھ ساتھ خود بھی پڑھتا رہا اور آخری بڑی ہمت کر کے اس نے نماز ختم کر لی۔ لیکن ایک بات نے اسے خاصا حیران کیا یہ شافعی شیخ اپنے آپ کو اس قدر عذاب میں کیوں مبتلا کرتا ہے؟ بڑی دقت سے اس نے اپنی نماز ختم

کی تھی۔ صبح لڑکے نے ہمت کر کے اپنے بھائی سے پوچھا۔ اس نے وضاحت کی کہ یہ شیخ جنون کی حد تک دیندار ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پوری عقیدت پورے خلوص اور دل و دماغ کے مکمل انہاک کے ساتھ شروع سے آخر تک نماز ادا کرے۔ اس لئے اگر تمہیں لگے کہ وہ رک رہا ہے یا الجھ رہا ہے اور پھر ابتدا سے دعا شروع کر رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دھیان دنیاوی باتوں کی طرف بھٹک گیا ہوگا اور وہ انہیں اپنے ذہن سے نکالنے کے لئے پوری توجہ خدا کی طرف کرنا چاہتا ہے۔

صبح کی نماز کے علاوہ شیخ بہت خاموش رہتا تھا اور مشکل سے ہی اس کے وجود کا احساس ہوتا تھا۔ لڑکے کو اس کی آواز سے مانوس ہونے اور اپنی ہنسی کو ضبط کرنے میں کافی دن لگے۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں وہ توہم پرستی کے اس شکار سے ہمدردی محسوس کرتا تھا جو فطری ہو یا نہ ہو ذہن کو اس قدر عذاب میں مبتلا کر سکتی ہے۔

اس کی آواز کے علاوہ شیخ کے متعلق صرف دو کہانیاں لڑکے کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ایک کا تعلق براہ راست اس سے تھا لیکن دوسری اس نے سنی تھی۔ پہلا واقعہ اس وقت رونما ہوا جب لڑکا خاصا بڑا ہو گیا تھا اور تعلیم میں کافی آگے بڑھ گیا تھا۔ ہوا یوں کہ شیخ ایک روز اپنے درس میں ''تلخیص'' کے ایک مشہور فقرے کی وضاحت کر رہا تھا۔ ''ہر لفظ کے معنی متن کے حساب سے بدل جاتے ہیں'' اس فقرے پر کتنی سیاہی لنڈھائی گئی۔ خلاصوں میں، تفصیلات میں، تشریح، تنقید اور اعتراضات پر جب کہ یہ ہمیشہ سے روز روشن کی طرح واضح ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اظہر میں اپنے بہت سے پیشروؤں کی طرح شیخ بھی اس فقرے کے تجزیے میں لگ گیا اور اس میں ہر لہو ولعب علیحدہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے اس پر اتنا زور لگایا کہ اس کی آواز بیٹھ گئی۔ پیشانی پسینے سے شرابور ہو گئی اور بے دم ہو گیا۔ تعلیم کی لگن بے شک ایک ایسا بوجھ ہے جسے بہت مضبوط لوگ ہی اٹھا سکتے ہیں۔

لڑکا اب شیخ کی باتوں پر بھی ایسے ہی تنقید کرنے لگا جیسے وہ دوسرے اساتذہ پر کرتا تھا لیکن شیخ اسے ایسے منہ توڑ جواب دیتا جو اس میں جھنجھلاہٹ، غصہ اور حقارت کے جذبات پیدا کرتا۔ وہ کہتا۔ ''بیٹا اسے جانے دو۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ تم چھلکوں پر ہی گزارا کرو۔ رس تمہارے لئے نہیں ہے نہ تم اس کے اہل ہو۔'' یہ کہہ کر وہ ہنستا اور اس

کے ساتھ ساری کلاس ہنستی۔ لڑکا درمیان سے درس چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے برداشت کرتا رہا۔ پھر ایک دوست اسے علیحدہ لے گیا۔ جسے شیخ ''چھلکے'' کہتا تھا دراصل وہ مسبر د کا ایک درس تھا جس کا موضوع ادب تھا۔ اس روز سے شیخ لڑکے کی نظروں سے گر گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے دوستوں میں شیخ کا مذاق اڑانے لگا۔

دوسرا قصہ صرف ہنسی اور مذاق کا سبب بنا بلکہ لڑکا اس کی وجہ سے شعر کہنے پر مائل ہوا۔ یہ ایک عام اور سیدھا سا واقعہ تھا لیکن جوانی کے قہقہے سے زیادہ معصوم اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

شیخ کا ایک بیٹا تھا جو کچھ ایسا ذہین نہیں تھا اور اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے اندازہ ہو کہ وہ تعلیم کی طرف رجحان رکھتا تھا۔ تاہم وہ ایک طالب علم تھا وہ اپنے باپ کے کمرے میں رہتا تھا اور اسی کی طرح خاموش اور سب سے لاتعلق تھا ایک روز بلکہ ایک رات کچھ احباب باپ سے ملنے کے لئے آئے اور بیٹے کو کافی لانے کے لئے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ کافی لے آیا اور شیوخ نے اپنے پیالے بڑے اشتیاق سے اپنے ہونٹوں کو لگائے۔ انہوں نے ایک چسکی لی۔ بلکہ لمبا سا ایک شڑ شڑ کرتا ہوا گھونٹ لیا لیکن جونہی وہ گھونٹ ان کے حلق میں گیا فوراً ہی انہوں نے قے کر دی۔ سب کھانسنے لگے اور زور لگا لگا کر اسے باہر نکالنے لگے۔ کافی اور لعاب ان کی ڈاڑھیوں پر پھیل گیا اور کفتان تک بکھرا گیا۔ وہ بڑی بے چینی سے کھانستے رہے۔ اصل میں کافی کے بجائے انہوں نے نسوار پی لیا تھا۔ شیخ کے بیٹے سے غلطی ہوگئی تھی اور اس نے کافی کے بجائے نسوار کا ڈبہ لیا تھا۔

شیخ سے جھگڑنے کے بعد لڑکے نے اس کا درس چھوڑ دیا اور ایک اور شیخ کے درس میں شامل ہو گیا جس کا کمرہ لڑکے کے کمرے کے ساتھ تھا۔ یہ شخص بھی شافعی تھا لیکن اسے اتنا جنون نہیں تھا۔ وہ بے انتہا خاموش۔ بے انتہا سنجیدہ انسان تھا اور جتنا خاموش طبع تھا اتنا ہی نیک دل بھی تھا۔ سلام دعا کے علاوہ لڑکے نے اس کے منہ سے کبھی ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا مسجد کے ایک گنبد کے نیچے لڑکے نے اس کے درس میں پہلی بار شرکت کی۔ لڑکا اس مسجد سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس لئے تقریباً اس کے ہر گوشہ میں وہ گرائمر یا بلاغت کے درس میں شریک ہو چکا تھا۔ بعد میں ہم ایسے اور واقعات کا ذکر بھی کریں گے جو اس مسجد میں پیش آئے۔

’’چھلکے‘ والے درس کے بعد لڑکا دوپہر کو یہاں آیا۔ جانی پہچانی سیڑھیوں پر وہ آسانی سے چڑھ گیا۔ اس نے جوتے اتارے اور طلباء کی دو جماعتوں کے درمیان سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر وہ گنبد کی دہلیز پر چڑھا اور درس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے طلبا کے دائرے میں شامل ہوگیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شیخ نہایت متانت سے آیا اور درس شروع کر دیا۔ خدا کی حمد اور نبی ﷺ پر درود کے بعد وہ ایک مبہم سے موضوع کے متعلق ایک عبارت پڑھنے لگا اور آخر قرآن کی آیت تک پہنچا۔

’’رضائے الٰہی کا اشارہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔‘‘ پھر مصنف۔ عالم اور شارح کی اتباع کرتے ہوئے اس جملہ کی وضاحت چاہی۔ نوجوان کو یہ اصطلاحات قطعی پسند نہیں آئیں۔ وہ خود کو قابو میں نہ رکھ سکا اور شیخ کی باتوں پر اعتراضات کرنے لگا لیکن ابھی بمشکل ہی اس نے زبان کھولی ہوگی کہ شیخ نے اسے روک دیا اور پرسکون دھیمے لہجے میں کہا ’’بیٹے خاموش ہو جاؤ۔ خدا تمہاری آنکھیں کھولے اور تمہیں معاف کرے اور ہمیں تم جیسے شر پسندوں سے بچائیے۔ اللہ کے غضب سے ڈرو اور اس درس میں ہمیں تنگ نہ کرو۔ جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ۔ جہاں اندھے اندھوں کو گمراہ کرتے ہیں۔‘‘

اس ڈانٹ پر بڑا قہقہہ پڑا۔ نوجوان نے سر جھکا دیا اور غصہ میں خاموش کھڑا رہا اور شیخ اسی دھیمے پن سے اور اطمینان سے ساتھ عبارت اور شرح پڑھتا رہا۔ وہ منہ پھلائے وہیں کھڑا رہا حتیٰ کہ دائرہ بکھر گیا اور پھر غصہ میں بھرا وہ باہر چلا گیا۔

چنانچہ بلاغت کے درس سے اسے باقی سال کے لئے نکال دیا گیا۔ ’’چھلکے‘‘ کے بعد دوپہر کے وقت وہ باب الملق کی لائبریری میں چلا جاتا تھا اور غروب آفتاب تک اس کے بند ہونے تک وہیں رہتا۔

کیا یہ محض اتفاق تھا کہ دونوں شیخوں نے اسے اپنے درس سے خارج کر دیا تھا یا یہ کوئی ملی بھگت تھی؟ اسے کبھی معلوم نہیں ہوا۔ بہرحال ان دونوں واقعات کا بیان ابھی قبل از وقت ہے۔ ہم اس قصہ کو چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر رہائشی علاقہ میں چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ نوجوان طالب علم جب وہاں وارد ہوا تو اس جگہ کیا ہو رہا تھا۔

MashalBooks.org

۱۰

عمارت کے دائیں گوشہ میں ایک خاندان رہائش پذیر تھا جس کا وہاں ہونا لڑکے کی سمجھ سے باہر تھا۔ پہلے تو یہ کہ وہاں آئے کس طرح اور اگر آ بھی گئے تھے تو اس کمرہ میں کیوں رہتے تھے جو ہر طرف طلباء سے گھرا ہوا تھا۔ یہ یقیناً بہت بہتر ہوتا کہ وہ نچلی منزل میں رہتے جہاں تاجر اور مزدور رہتے تھے۔ اس کے بجائے وہ علم کی دنیا میں چلے آئے اور طلباء اور اساتذہ کے درمیان رہنے لگے۔ نہ انہوں نے کسی کو تنگ کیا اور نہ کوئی ان کے معاملات میں مخل ہوا۔ لیکن ان کی کبھی کسی سے دوستی بلکہ شناسائی بھی نہیں ہوئی۔

عمارت تو ایک طرف خود قاہرہ میں ہی یہ خاندان کچھ بے تکا سا لگتا تھا۔ ان کی بولی سے لگتا تھا کہ وہ بالائی مصر سے آئے ہیں۔ بہت دور جنوب سے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ پہلی منزل میں ٹھہرنے کے بجائے وہ دوسری منزل پر چلے گئے تھے۔ اس لئے کہ دوسری منزل پر سب باہر کے لوگ تھے۔ سکندریہ کا ایک شیخ۔ دو ایرانی۔ مختلف طلباء اور اساتذہ جن کا تعلق ملک کے مختلف حصوں سے تھا ایسے اجنبیوں کے درمیان یہ خاندان خود کو اتنا الگ تھلگ محسوس نہ کرتا۔ دوسری طرف۔ پہلی منزل پر رہنے والے تاجر اور مزدور قاہرہ کے رہنے والے تھے یا اتنے عرصہ سے وہاں رہ رہے تھے کہ انہوں نے وہاں کی زبان اور طور طریقے اپنا لئے تھے اور وہ مقامی لوگوں سے مختلف نہیں لگتے تھے۔

اس خاندان میں دو افراد تھے۔ ایک بوڑھی عورت جو یقیناً ساٹھ سال سے اوپر تھی اور اس کے لئے قاہرہ کی زبان اور طور طریقے اختیار کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ ایک اس کا لڑکا تھا بیس تیس برس کا ایک نوجوان جو کچھ عرصہ میں قاہرہ کے لوگوں میں گھل

مل سکتا تھا۔ ماں کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے بالائی مصر کی اور بہت سی عورتیں یہاں آ کر رہتی ہیں۔

اگر چہ اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔یعنی روزگار نہیں تھا۔لیکن وہ گھر میں اپنے حصہ کا سارا کام کرتی تھی۔ بیٹا سارا دن گلیوں میں مارا مارا پھرتا اور شام کو کھانے کے لئے کچھ لے کر لوٹتا جب کہ ماں گھر کی دیکھ بھال کرتی اور اپنے اور بیٹے کے لئے کھانا تیار کرتی۔

بیٹا ایک پھیری والا تھا اور اپنا مال خود بناتا تھا۔ وہ صبح سویرے کمرے میں کام کرنا شروع کر دیتا اور دوپہر کے قریب۔ جب سورج سر پر ہوتا۔ وہ اپنا بنایا ہوا مال لے کر سڑک پر جاتا اور گلی کوچوں میں جہاں جہاں اس کے قدم اسے لے جاتے ہیں اس کے گن گاتا پھرتا۔ چاہے وہ نزدیک جائے یا اسے دور جانا پڑے وہ تمام مال بیچے بغیر واپس نہ آتا۔ سردیوں میں وہ ایک قسم کی مٹھائی بیچتا جسے وہ غزل النبات کہتا تھا اور گرمیوں میں جیلاتی یا دندورمہ۔

مٹھائیاں بناتے ہوئے نوجوان خوش خوش گاتا رہتا۔لگتا ایسا ہی تھا۔ ورنہ ہوسکتا ہے کہ وہ خود کو خوش رکھنے کے لئے زبردستی ایسا کر رہا ہو۔ چیزیں تیار کرنے کے بعد وہ خاموشی سے ہمارے کمروں کے آگے سے گزرتا۔سیڑھیوں سے نیچے اتر کر وہ راستہ پر جاتا تو بہت خوبصورت اور سریلی آواز میں گانا شروع کر دیتا۔ اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے گن گاتا اور لڑکیوں اور عورتوں کو ان کے خریدنے کی ترغیب دیتا۔ لگتا تھا کہ جب وہ اپنے کمرے میں ہوتا تو کھل کر گاتا لیکن جب وہ شیوخ اور طلباء جیسے سنجیدہ اور لائق احترام لوگوں کے کمروں کے آگے سے گزرتا تو خود کو قابو میں رکھتا۔ جب وہ گلی میں پہنچتا تو عام پھیری والوں کی طرح گاتا اور گاہکوں کو بلاتا۔ وہ یقیناً محسوس کرتا ہوگا کہ ایسے کمروں کے باہر اپنی مٹھائیوں کی بات کرنی مناسب نہیں تھی۔ وہ سنجیدہ لوگ تھے اور مٹھائی وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ان کو صرف تعلیم کا شوق تھا۔ غالباً نوجوان پھیری والے کو غلط فہمی تھی اور حقیقت میں اس بلاک میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسے پسند کرتے تھے اور اس کی مٹھائی کے شوقین تھے۔ وہ یقیناً اسے روکتے اور سب سے پہلے اس کے خریدار بنتے لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں تھی یا تو وہ شرماتے تھے یا ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔

لیکن ایک دن آیا کہ اس کے گانے بند ہو گئے اور ان پلیٹوں کی کھنکھناہٹ بھی جس میں وہ اپنی مٹھائیوں کو ہلاتا۔ اس کے بجائے دوسری آوازیں اور دوسرے گانے سنائی دیتے۔ عورتیں اس کے کمروں میں آتی جاتیں پہلے ہنستی چلاتی ہوئی اور پھر خوشی سے چیختے ہوئے اور ڈھول پیٹتے ہوئے حتیٰ کہ شیوخ اور طلباء کے لئے زندگی ناقابل برداشت ہو گئی۔

لیکن لڑکے کو اس میں بڑا مزہ بڑا سرور تھا۔ یہ گانا بجانا اور خوشی کے نعرے اسے اپنے گاؤں کی یاد دلاتے۔ ان میں اسے وہ سرخوشی محسوس ہوتی۔ گو بالکل وہی نہیں جیسی اسے اپنے اساتذہ کی آوازیں لگتی تھیں جب وہ مسجد کے اندر لے میں سبق پڑھاتے تھے۔

پھر کچھ دیر کے لئے عورتوں کی ان خوشی کی آوازوں کے ساتھ دوسری آوازیں شامل ہو گئیں یہ مزدوروں کی آوازیں تھیں۔ جو کمرے میں سامان لا رہے تھے اور سیڑھیوں اور برآمدوں میں کھڑ کھڑ کر رہے تھے۔ وہ چلا رہے تھے۔ ہنسی مذاق کر رہے تھے گالیاں دے رہے تھے اور ایک دوسرے کو اکسا رہے تھے۔ عورتیں ان کی ہمت بڑھا رہی تھیں اور تنبورے بجا بجا کر اور شور وغل اور گیتوں کے ساتھ ان کے ہاتھوں سے سامان لے رہی تھیں۔ کبھی کبھی نچلی منزل سے کسی عورت کا پرمسرت گیت گونج اٹھتا۔ شاید اس سارے ہنگامہ میں اسے اپنی شادی کی رونق یاد آ گئی یا اسے اس وقت کا خیال آیا جب اس کا بیٹا یا بیٹی بیاہی جائے گی۔ ایسے دن جو صرف ایک بار ہی آتے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی اوپر والی عورتوں کے ساتھ گانے اور غل مچانے میں شامل ہو گئی گو دولہا والوں سے اس کی کوئی دوستی نہیں تھی۔

پھر وہ اہم دن آ گیا۔ شیوخ اور طلباء اس ہنگامہ سے بہت پریشان رہے اور ان میں سے جو زیادہ پڑھا کو تھے وہ سکون کی تلاش میں اپنے کمرے میں چھوڑ کر دوستوں کے ہاں یا مسجدوں میں چلے گئے تھے جمعرات کا دن آیا اور شور اور بھی بڑھتا گیا یہاں تک کہ یہ تمام حدوں سے گزر گیا اور گلی تک گونجنے لگا۔ شامیانہ لگایا گیا اور سہ پہر کو بینڈ بھی بجنے لگا۔ پھر دوسرے علاقوں سے بھی لوگ بڑے جوش وخروش سے آنا شروع ہو گئے۔ وہ کھانا کھاتے۔ ایک دوسرے سے ملتے اور گانوں سے محفوظ ہوتے۔ لڑکا تمام وقت کھڑکی میں کھڑا رہتا اور کسی بات سے توجہ نہ ہٹاتا۔ وہ علم اور علماء۔ اظہر اور اظہر والے حتیٰ کہ کھانا

MashalBooks.org

اور چائے۔ اس ہنگامہ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ بینڈ نے تو اسے پاگل کر دیا تھا۔ قاہرہ میں اس سے پہلے اس نے بینڈ کو نہیں سنا تھا۔ اس کے لوگ گیت بڑے مسحور کن تھے اور جس شیخ کو گانے کیلئے بلوایا گیا تھا وہ بھی بہت اچھا تھا۔

اس روز لڑکے کا بھائی اور اس کے دوست بڑی بدتمیزی کے ساتھ وہاں سے چلے گئے۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا وہ رات پڑنے تک وہیں کھڑا رہا تھا۔ چچا حاجی علی چلاتا ہوا اور اپنی لاٹھی مارتا ہوا تقریباً کمرے سے باہر ہی گیا تھا کہ لوگوں کو نماز کے لئے بلائے۔ اگر وہ واقعی جاتا تو کوئی اس کی طرف دھیان نہ دیتا۔ اس سارے ہنگامہ میں اس کی چیخ و پکار کون سنتا۔ اچانک ایک بڑی بھیانک چیخ سنائی دی جس میں بڑا کرب تھا اور پھر خوشی کے نعرے جو ہر طرف بکھر گئے۔ جیسے اس کربناک آواز کے جواب میں اٹھے ہوں۔ نوجوان اپنی بیوی کا مالک ہو گیا تھا۔

پھر رات ہو گئی بوجھل اور سست رات۔ جس نے ہر شے پر اپنا سیاہ ہاتھ پھیر دیا۔ لالٹینیں پہلے ہی بجھا دی گئی تھیں اور آوازیں دھیمی ہو گئی تھیں۔ ایک چور کی طرح نیند وہاں گھس آئی تھی اور اس نے سب کو اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا تھا۔ لیکن لڑکا نہیں سویا۔ وہ اپنی کھڑکی سے ذرا بھی نہیں ہلا اور مسلسل لمبی آہوں اور بھرپور خوشی کی لہروں کے متعلق سوچتا رہا جو اس کے چاروں طرف رقصاں تھیں۔ قریب ہی ایک آواز نے اسے جھنجھوڑا جو یہ کہہ رہی تھی کہ ''نماز نیند سے بہتر ہے''۔ واقعی۔ نماز نیند سے بہتر ہے۔ لیکن نینداس رات لڑکے کو بالکل نہیں آئی۔ البتہ جب موذن اذان ختم کر چکا تو وہ وضو کر کے نماز کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر وہ کمبل میں گھس گیا اور نیند میں غرق ہو گیا۔ اسے کسی بات کا ہوش نہ رہا حتیٰ کہ جب سورج چڑھ چکا تو چچا حاجی علی آیا اور بہت زور سے دروازہ کھٹکھٹا کر وہ حسب دستور چلایا۔

''اٹھو............لڑکے............اٹھ جاؤ۔''

۱۱

لڑکے کی رہائش اور قاہرہ میں اس کے ماحول کا ذکر دو قسم کے لوگوں کی بات کئے بغیر نامکمل رہے گا۔ جو اس عمارت میں رہتے تھے مگر اس کے باوجود اجنبی تھے اور دوسرے وہ جو کبھی کبھی آتے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے یہاں کے مستقل مکین ہوں۔ پہلے گروہ میں وہ شیخ تھا جس کی عمر 50 سے اوپر تھی جس نے پوری محنت اور مستقل مزاجی سے سند بھی حاصل کر لی تھی لیکن اسے محض برائے نام ہی علم حاصل ہو سکا۔ اس نے جب بھی امتحان دیا ناکام ہو گیا۔ ہر شخص اس کے متعلق ناامید تھا لیکن وہ ناامید نہیں تھا۔ بظاہر وہ اس عمارت میں ہی رہتا تھا لیکن اس کی روح کہیں اور تھی۔ گاؤں واپس جاتے ہوئے اسے شرم آتی تھی کہ وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کیسے کرتا چنانچہ وہ قاہرہ میں ہی ٹھہرا رہا۔ اپنی کوششوں کو ناکام ہوتے ہوئے دیکھتا رہا اور دور سے ہی اپنے خاندانی معاملات کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ جمعرات کی شام کو وہ ان سے ملنے کے لئے وقت نکال لیتا اور ہفتہ کی صبح کو واپس آ جاتا۔ اس کے پاس اتنا پیسہ تھا بلکہ اس کی ضروریات سے زیادہ تھا اور ان غریب طلباء کے درمیان وہ رئیسانہ ٹھاٹھ سے رہ رہا تھا۔ اس کا کمرہ نفاست سے سجا ہوا تھا جہاں وہ صبح سے رات تک رہتا صرف کبھی کبھی باہر نکلتا اور یوں پڑھائی میں انہماک کا تاثر دیتا۔ اس نے اپنے مضمون پر عبور حاصل کر لیا تھا اور تمام کتابوں کو حفظ کر لیا تھا اس لئے درس میں حاضری دینا اس کے لئے ضروری نہیں تھا۔ اگر قسمت اس کی یاوری کرتی اگر وہ خوش قسمت ہوتا تو وہ بھی شیخ کی طرح عالم فاضل ہوتا اور بڑے بڑے درس دیتا۔ جب وہ طالب علم تھے تو وہ ان کا دوست تھا اور ان کے ساتھ شیخ امبابی کے درس میں جاتا یا شیخ اشمونی سے ملتا

لیکن قسمت نے ان کا ساتھ نہ دیا تھا اور اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ اب استاد تھے اور یہ اسی طرح طالب علم۔ دو منزلوں کے درمیان آدھا طالب علم۔ آدھا شیخ۔

تاہم اس نے اساتذہ کی اکثر خصوصیات اپنا لی تھیں۔ وہ نوجوانوں کے ساتھ درس میں جاتا تھا نہ ان کے ساتھ پڑھائی کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ انہیں شرف ملاقات بخشتا۔ کبھی وہ دعوت دیتے کبھی یہ دعوت دیتا۔ کبھی کھانے پر کبھی چائے پر۔ اس کا انداز کچھ دوستانہ ہوتا کچھ بردباری کا۔ وہ بڑی دھیمی اور گہری آواز میں گفتگو کرتا۔ ایک ایک حرف کو صاف صاف ادا کرتا۔ البتہ اس کی گفتگو قطعی عالمانہ نہ ہوتی۔ بس یہ اسی حد تک علمی ہوتی کہ کبھی کبھی اس میں اظہر کے اساتذہ کا ذکر آ جاتا جنہیں وہ بڑی حقارت سے دیکھتا۔ اگر کبھی ان کے حق میں کوئی کلمہ بھی ان کی زبان پر آتا تو وہ ہمیشہ ان کی تعریف سے اجتناب کرتا اور برائی کرنے میں کسر نہ چھوڑتا۔ دوسرے موضوعات وہ ہوتے تھے جن میں اس کی دولت، اس کے گھریلو معاملات، اس کی گاؤں سے عقیدت، علاقہ میں اس کی عزت بلکہ اصل میں سارے صوبہ میں اس کی شہرت تھی۔ پھر اس کے بھائی تھے جو بڑے اچھے کسان تھے اور یہ بڑا تیکھا جوان۔ اس قدر ذہین مگر بدقسمت۔ جو اب تک ابتدائی سند بھی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ حالانکہ وہ بیس برس کا ہونے والا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ نااہل اور بیوقوف تھا۔ وہ تو قسمت کا مارا ہوا تھا۔ گھر والے سر تھے کہ تقدیر سے لڑا جائے اور شیخ نے اپنے بھائی کی مدد کا تہیہ کر لیا تاکہ دونوں گمنامی سے نکل کر شہرت اور دولت حاصل کر سکیں۔ اس نے ملٹری اکیڈمی میں داخل کرانے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن شیخ اور اس کا خاندان تقدیر سے مقابلہ نہیں کر سکے۔ ملٹری کالج میں اسے داخلہ نہیں ملا اس لئے کہ وہ اس کا اہل نہیں پایا گیا۔ شیخ نے پھر مقدر کو ذمہ دار ٹھہرایا اور پھر اس کے خلاف مستعد ہو گیا۔

یہ کہانی وہ بڑی روانی کے ساتھ بیان کرتا تھا۔ اس کا تسلسل صرف حقہ کی گڑگڑاہٹ سے ٹوٹتا جو قہوہ خانہ کا مالک صبح۔ دوپہر اور شام ڈھلے اس کے تیار کرتا یا جسے وہ کبھی کبھی خود بھی تازہ کر لیتا یا اس کا نوکر اسے تیار کر کے لے آتا۔ طلباء جو شیخ کی امارت سے اتنے ہی مرعوب تھے جتنے وہ اس کی جہالت اور حماقت سے واقف تھے ان باتوں کا بہت اثر لیتے۔

MashalBooks.org

لڑکے کو اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز شیخ نے اپنے کچھ فرنیچر کو نکالنے کا فیصلہ کیا اور بہتر اور مہنگی چیزیں خریدنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس نے پرانی چیزیں طلباء کو دے دیں۔لڑکے کے بھائی کے علاوہ اور کسی نے ایسا لالچ نہیں کیا۔اس نے برتن رکھنے کی ایک ایسی الماری خرید لی جس کے اوپر نیچے دو خانے تھے۔ نچلے خانے میں دو مضبوط دروازے تھے۔اوپر کے خانہ میں شیخ کے کپڑے ہوتے اور سب سے نیچے اس کی کتابیں جن پر جلد نہیں تھی اور جو اس وجہ سے بہتر طور پر زیادہ محفوظ تھیں۔ایک گوشہ میں کتاب اور مٹھائیاں وغیرہ ہوتی تھیں۔ نچلے حصہ کے اوپر دو درازیں تھیں جن میں شیخ اپنے پیسے اور متفرق قسم کے کاغذات رکھتا۔ جب اس کا ماہانہ خرچ آتا تو اسے ان میں سے ایک دراز میں رکھتا اور روزانہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا نکالتا اور دونوں چابیاں اپنی جیب میں رکھتا۔ الماری کے اوپر کے حصہ میں شیشے کے دروازے تھے۔ان میں مجلد کتابیں رکھیں تھیں جو واقعی نمائش کے لائق تھیں۔

شیخ نے اپنی الماری پر بڑی سودا بازی کی۔ جو اخروٹ کی لکڑی سے بنی تھی اور اس کی قیمت ایک پاؤنڈ سے زیادہ بڑھ گئی۔نوجوان نے قیمت ادا کر دی لیکن اس خریداری کا اس پر اس کے بھائی پر کئی مہینہ بوجھ رہا۔ گھر سے آنے والے تھوڑے سے خرچہ میں سے وہ ماہانہ اس کی قسط نکالتے ۔ پھر ظاہر ہے کہ کتابیں بھی خریدنی تھیں اور ان پر خوبصورت سی جلدیں بھی چڑھوانی تھیں کہ شیشے میں سے ان پر چمکتا ہوا شیخ کا نام دکھائی دے سکے۔مہینہ کے خرچ میں سے ہی اس کے لئے بھی پیسہ نکالنا تھا۔ چانچہ دونوں طالب علموں نے مجبوراً قدرے مفلسانہ انداز سے رہنا شروع کر دیا۔ پھر یہ معمولی سا اثاثہ تمام خرچ پورا نہ کر سکا اور قرضوں کا سہارا لینا پڑا۔ دراز میں رکھنے کے لئے بہت کم پیسہ رہ گئے اور فوری ضروریات کے لئے لڑکے کے باپ سے درخواست کی گئی کہ یا تو خرچہ کی رقم بڑھائے یا کبھی کبھی کچھ فالتو پیسے بھی بھیج دیا کرے۔

بہر حال نئی الماری کے آنے سے لڑکا بہت خوش تھا اور کافی دیر تک اس میں مگن رہا نوجوان شیخ کے پاس ایک بہت لمبا چوڑا صندوق تھا جس سے لڑکا بچپن ہی سے واقف تھا جب اس کی ماں اس میں کپڑے رکھتی تھی۔خصوصاً وہ کپڑے جو بہت قیمتی ہوتے۔اس کا ڈھکنا باہر کی طرف ابھرا ہوا تھا اور جب اسے اٹھایا جاتا تو نیچے بہت جگہ نظر آتی۔لڑکے کو

اس میں دو درازیں نظر آئیں جن میں اس کی ماں۔ اگر اسکے پاس کوئی قیمتی چیزیں ہوتیں تو محفوظ کرتی تھیں۔ لڑکا اکثر اس کے گرد کھیلا کرتا تھا۔ اس پر ادھر ادھر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھتا تھا اور زمین پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو کہانیاں سناتا تھا یا ان سے کہانیاں سنتا تھا پھر ایک دن یہ صندوق اس جگہ سے غائب ہو گیا۔

بات یہ تھی کہ صندوق کو دریائے نیل پر لے جایا گیا تھا جہاں سے اسے قاہرہ کے لئے کشتی پر چڑھانا تھا۔ جہاں سے نوجوان شیخ اسے حاصل کر کے اس میں کتابیں اور کپڑے وغیرہ رکھنے کے لئے لے جاتا۔ لڑکے کو اس صندوق کے جانے کا بہت افسوس تھا۔ اس کے بعد اپنی بہنوں کے ساتھ باتیں کرنے کے لئے اسے خالی زمین پر بیٹھنا پڑتا تھا۔

جب لڑکا قاہرہ پہنچا تو اسے اس صندوق کو چھونے کا بڑا اشتیاق تھا۔ وہ اس پر بیٹھنا چاہتا تھا اور اس کی چکنی سطح پر انگلیاں پھیرنا چاہتا تھا لیکن صندوق بہت پرے رکھا ہوا تھا۔ دور کونے میں جہاں اس تک پہنچنا مشکل تھا۔ البتہ جب نئی الماری آ گئی تو نوجوان شیخ کی کتابیں اور کپڑے اس میں منتقل ہو گئے۔ صندوق کی اہمیت کم ہو گئی اور اسے ایک کونے میں رکھ دیا گیا جو لڑکے کے بائیں طرف تھا۔ اس سے کہا گیا کہ وہ اگر چاہے تو اپنی کتابیں اور کپڑے اس صندوق میں رکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد سے لڑکا دن میں اپنے گوشہ سے اٹھتا اور اس صندوق کے پاس چلا جاتا۔ وہ صندوق پر چڑھنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں لوگ اس پر نہ ہنسیں۔ لیکن وہ دروازے کے قریب اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ اپنا ہاتھ صندوق پر رکھ دیتا اور اس پر چڑھنے کے موقع کے تاک میں رہتا اور بڑے شوق سے اس پر ہاتھ پھیرتا رہتا یا پھر وہ ڈھکنا اٹھاتا اور اس کی درازوں کو ٹٹولتا لیکن وہاں اسے کبھی کچھ ملا نہیں۔ کبھی وہ جھک کر بہت نیچے رکھے ہوئے کپڑوں کو چھوتا اور خوش ہو کر انہیں الٹا پلٹا گویا یہ کوئی بڑا خزانہ تھا جو اس نے چھپا کر رکھا تھا۔ دن گزرتے گئے اور صندوق آہستہ آہستہ کتابوں سے بھرتا گیا۔

ایک اور اجنبی بھی اس عمارت میں رہتا تھا وہ بہت سے طالب علموں سے گھل مل گیا تھا اور ان کا پکا دوست بن گیا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا اور اس کی نظر کافی کمزور تھی۔ وہ بہت عرصہ اظہر میں زیر تعلیم رہا تھا اور اس عمارت میں کافی وقت گزارا تھا۔ اس نے علم حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر علم اس سے دور ہی رہا۔ وہ صرف طالب علموں کے لئے

ہی اجنبی نہیں تھا بلکہ اپنے کمرے میں قطار در قطار کتابوں سے بھی اجنبی تھا۔ اس نے باقاعدہ کلاسوں میں حاضری دی تھی اور بہت سے درس سنے تھے۔ آخر کار تنگ آ کر وہ گوشہ نشین ہو گیا اور سوائے میل ملاقات کے بہت ہی کم کمرے سے باہر دوسرے مکینوں سے گپ شپ کرنے کے لئے نکلتا لیکن اس کے دوست بھی پڑھائی کی غرض سے یا درس میں جانے کے لئے چھوڑ جاتے چنانچہ اس نے بھی ان سے ملنا چھوڑ دیا لیکن وہ بہت ہمدرد بہت نیک مزاج اور خوش گفتار تھا۔ وہ پوری طرح قابل اعتماد تھا۔ دوستوں کی مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا اور اگر اس کا قرضہ لوٹانے میں دیر ہو جاتی تو بڑے صبر سے کام لیتا۔

وہ اس سے بڑی عقیدت رکھتے اور ہمیشہ اس کی تعریف کرتے رہتے۔ وہ اس کی صحبت کو پسند کرتے تھے اور اس سے ملنے اور بات کرنے میں خوشی محسوس کرتے۔ چنانچہ وہ نہ قاہرہ کو چھوڑ سکا اور نہ اس رہائش کو حالانکہ وہ اپنی تعلیم کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ وہ قاہرہ میں ہی ٹھہرا رہا اور زندگی اسی طرح رواں دواں رہی۔ وہ اب طالب علم نہیں تھا نہ استاد تھا بلکہ دونوں کے درمیان کچھ تھا۔ کبھی کبھی عزیز یا رشتہ دار یا گاؤں کے لوگ اس سے ملنے آتے وہ اس کے لئے اچھی اچھی کھانے کی چیزیں لاتے جن پر وہ فوراً ہی اپنے دوستوں کو دعوت دیتا یا انہیں تحفہ کے طور پر بانٹ دیتا جب تک وہ وہاں مقیم رہے اس کے دوست کبھی اس کا ذکر محبت اور احترام کے بغیر نہ کرتے لیکن جب کبھی وہ اس کا ذکر کرتے تو اس کی بڑی تعریفیں کرتے۔

ایک شخص اور بھی تھا جو اس عمارت کے گرد ہی رہتا تھا گو نہ وہاں اس کا کوئی کمرہ تھا نہ وہ کسی جگہ ٹھہرتا تھا۔ اس سے بات کرنا تو درکنار اس سے ملنا بھی مشکل تھا لیکن اکثر لوگ سرگوشیوں میں اس کے متعلق باتیں کرتے تھے اور کبھی کبھی یہ چھپی چھپی تیز تیز باتیں ہنسی میں بھی بدل جاتیں لیکن پھر لوگ کچھ حیا کرتے اور خاموش ہو جاتے۔ یہ شخص وہاں آتا تھا مگر اس سے ملنے کوئی نہ جاتا۔ وہ کبھی تنہا نہ آتا۔ ہمیشہ اس کے ساتھ ایک اور شخص ہوتا۔ وہ نہ کبھی دن میں نظر آتا نہ اول شب نہ علی الصبح۔ وہ ہمیشہ رات گئے آتا جب لوگ گہری نیند سو رہے ہوتے۔

شروع میں اس کا آنا خاصا گورا تھا لیکن اس کے اثرات ان کے لئے جن سے وہ ملنے آتا ناگوار اور تلخ ہوتے۔ وہ ان ملاقاتوں سے سخت بددل ہوتے اور ان سے ان

کے کام اورصحت پر برا اثر پڑتا۔ وہ بیماریوں کا شکار ہو جاتے خصوصاً ز کام کا۔

یہ ابوطرطور (احمقوں کی ٹوپی والا) کے نام سے مشہور تھا۔ یہ واقعی بڑی شیطانی حرکت تھی کہ ایک ایسا شخص اندھیری رات میں کسی سوتے ہوئے شخص سے ملنے آئے۔ جب وہ چلا جاتا تو بیچارہ بڑبڑا کر اٹھ جاتا اور بڑی پریشانی سے ایک گناہگار کی طرح صبح کا انتظار کرتا۔ پھر وہ تیزی سے بستر سے اٹھتا نہانے دھونے میں کافی وقت لگاتا اور صاف ستھرا ہو کر صبح کے پہلے درس میں چلا جاتا۔ گرمیوں میں یہ بہت سیدھی سی بات ہوتی اس لئے کہ اس موسم میں مسجد کے حوض کے ٹھنڈے پانی میں غسل کرنے میں بڑا لطف آتا ہے اور جسم پر پانی انڈیلنے کا بھی بڑا مزہ ہوتا ہے اور یہ رسم بڑے اہتمام سے ادا کی جاتی ہے لیکن سردی کی رات ابوطرطور پر بڑی سخت گزرتی تھی۔ یا تو اس کا شکار (میزبان) اتنا فارغ نہ ہوتا کہ اس کے لئے پانی گرم کرے یا پھر اس میں اتنی استعداد ہی نہ ہوتی۔ چنانچہ ابوطرطور حمام پر جا کر نہاتا اور اپنے ہی پیسے خرچ کرتا۔

لیکن کوئی چارہ نہیں تھا۔ اظہر اور اس کے اساتذہ دعوت دے رہے تھے اور وہاں جانے کے لئے جسمانی اور اخلاقی دونوں طور سے پاک صاف ہونا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ اظہر جانے سے پہلے جلدی جلدی جسم کو رگڑ رگڑ کر ٹھنڈے پانی سے دھو لیا جائے۔ مسجد کے حوض میں غسل بہتر تھا۔ بس زیادہ سے زیادہ ایک کپکپی ہی ہوتی۔ گھر پر پانی خریدنا پڑتا تھا اور صرف پینے کے لئے استعمال ہوتا تھا یہاں تک کہ سخت ضرورت کے وقت بھی پانی خرچ کرنے سے گریز کیا جاتا۔

ابوطرطور اندر آنے کیلئے ہر طرح کے حربے استعمال کرتا وہ سیڑھیوں کے اوپر ایک کونے میں تاک لگائے بیٹھا رہتا اور پڑھنے یا درس کی تیاری کرنے والے طلباء پر کوئی توجہ نہ دیتا لیکن جونہی وہ کام ختم کر لیتے اور بائیں طرف کے گوشہ میں بوڑھے شخص کے پاس چلے جاتے یا دائیں طرف آخری کمرے میں ادھیڑ عمر طالب علم سے ملنے چلے جاتے تو ابوطرطور اٹھتا اور اچانک ان پر آ دھمکتا۔ وہ چوری سے کمرے میں داخل ہوتا اور خود کو بزرگ شخص یا ادھیڑ عمر طالب علم ظاہر کرتا۔ وہ ان کے ہونٹوں سے ان کی آوازوں میں بولتا اور لڑکوں کے ذہن جو پڑھائی میں مصروف رہتے۔ بھٹک جاتے اور برے برے خیالات میں پھنس جاتے جب وہ اپنے میزبان سے رخصت ہو کر سونے کیلئے چلے جاتے اور ابوطرز

طور گناہ کے اس کاروبار کے لئے اپنا شکار چن لیتا۔

کبھی کبھی جب ابوطرطور سیڑھیوں کے اوپر کونے میں دبکا ہوتا تو لڑکی کسی طالب علم کے دھلے ہوئے کپڑے لے آتی یا میلے کپڑے لے کر وہاں سے گزرتی تو وہ بڑی خاموشی سے اور کسی کی نظر پڑے بغیر لڑکی کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا۔ جونہی لڑکی نوجوان کے کمرے میں داخل ہوتی ابوطرطور لڑکی کی ایک نظر یا ایک لفظ کے سامنے سمٹ جاتا۔ وہ اس لڑکی کے ہونٹوں پر بکھرا ہوا تبسم یا اس کے پہلو کی ایک جنبش بن جاتا۔

پھر لڑکی چلی جاتی اور ابوطرطور بھی اس کے ساتھ چپکے سے بغیر اس کی نظر پڑے چلا جاتا لیکن اس نوجوان سے اس نے ایک وعدہ کیا ہوا تھا۔ جو وہ اندھیری رات میں بھی پورا کرتا۔

کبھی ابوطرطور بڑی ہوشیاری سے کام لیتا اور مکروفریب کی لڑیاں جوڑتا چلا جاتا۔ آخری منزل سے پہلے ہی وہ نچلی منزل میں عورتوں کے درمیان آجاتا جہاں وہ اونچی آواز میں جھگڑ رہی ہوتیں، ہنس رہی ہوتیں، یا باتوں میں مشغول ہوتیں۔ یہ سب شور ایک اچھا خاصا کنسرٹ بن جاتا۔ تب ابطرطور اپنی عیاریاں دکھاتا۔ ان آوازوں میں سے کبھی کوئی نقرئی آواز ابھرتی یا کوئی پہلو تھرکتا۔ پتہ نہیں یہ ابوطرطور کی کوئی انسانی یا شیطانی حرکت ہوتی جو نوجوان کو اس کے کمرے میں جھنجھوڑتی اور غائب ہو جاتی لیکن اس کے خون میں ایک زہر گھول جاتی جس کا آدھی رات کے وقت شیطان سے ملاپ ہوتا۔

یوں اس عمارت اور اظہر میں طالبعلموں کی زندگی پوری طرح سادہ نہیں تھی۔ صرف تعلیم ہی سب کچھ نہیں تھی۔ لڑکے کی صورت حال بھی یہی تھی۔ ابوطرطور زیادہ دور نہ ہوتا۔ وہ ہمیشہ انہیں عیش اور تاسف کی دعوت دیتا رہتا۔ ان ملاقاتوں کے بعد جو باتیں ہوتیں وہ لڑکے کو بہت کچھ سوچنے کا مواد مہیا کرتیں۔

MashalBooks.org

۱۲

یہ تھی عمارت اور یہ تھا اس کا ماحول جس میں لڑکا رہتا تھا۔ انسانی کردار اور زندگی کے تجربہ کے متعلق جتنا براہ راست تجربہ اسے یہاں حاصل ہوا وہ اتنا ہی مفید تھا جتنا اظہر میں گرامر، منطق، قانون اور دینیات میں اس کی کامیابیاں۔

آنے کے دو تین روز بعد بھائی نے ایک شیخ کے حوالہ کر دیا جو اسی موسم گرما میں سند حاصل کر چکا تھا اور پہلی بار کچھ لڑکوں کو پڑھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ چالیس برس کے لگ بھگ تھا اور اسے ذہین اور عالم سمجھا جاتا تھا۔ اس نے قسمت سے نبرد آزمائی کی تھی اور کامیاب رہا تھا۔ یقیناً یہ کامیابی اس کی اہلیت کے مطابق نہیں تھی اس لئے گو وہ کامیاب ہو گیا تھا اور دوسرے درجہ میں پاس ہوا تھا مگر عام خیال یہ تھا کہ فرسٹ کلاس حاصل کرنے میں قسمت نے اس کی یاوری نہیں کی۔ اس کی ذہانت صرف کتابوں کو یاد کرنے تک محدود تھی۔ جب وہ عملی زندگی کے معاملات پر اظہار خیال کرتا تو خاصا احمق نظر آتا۔ دوست، اساتذہ اور طلباء سب ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ عیش پسند ہے جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کسی برائی کی طرف مائل تھا یا اس میں کوئی خامی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فطرتاً شاہ خرچ تھا۔ کھانے کے معاملہ میں وہ بہت بدنام تھا اور گوشت سے تو کبھی اس کی نیت سیر نہ ہوتی۔ چاہے کوئی بھی مجبوری ہو وہ ایک دن بھی صبر نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اس کی آواز بہت ہی عجیب تھی۔ کانپتی ہوئی اور جھٹکے کھاتی ہوئی وہ ایک ایک حرف کو علیحدہ طور پر ادا کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ آپس میں الجھ جاتے حالانکہ وہ اپنے منہ کو ضرورت سے زیادہ کھولتا۔ اس سے گفتگو کرنے والا زیادہ دیر تک ہنسی ضبط نہ

کر سکتا اور کچھ ہی دیر بعد وہ اس کی ہکلاہٹ اور جھرجھراتی ہوئی آواز کی نقل کرتا نظر آتا اور اس کی طرح منہ بنا بنا کر بولتا۔

ابھی اس نے سند حاصل ہی کی تھی کہ وہ جبہ و دستار خریدنے کے لئے دوڑا اور فوراً ہی اس نے چغہ پہننا شروع کر دیا۔ عام طور پر شیوخ سند حاصل کرنے کے کچھ دیر بعد ہی ان کو پہنتے۔ جب ان کو کچھ شہرت حاصل ہو جاتی اور ان کے حالات بہتر ہو جاتے۔

لیکن اس نے فوراً ہی جبہ خرید لیا اور شیوخ اور طلباء دونوں ہی اس پر ہنسے۔ وہ اس بات پر اور بھی ہنسے کہ گو اس نے جبہ پہن لیا تھا جوتوں میں اس کے پاؤں فقیروں کی طرح ننگے تھے۔ وہ کبھی جرابیں نہیں پہنتا تھا کہ یا تو اس کے پاس پیسے نہ ہوتے یا وہ کفایت شعاری سے کام لیتا۔ سڑکوں پر وہ بڑی بارعب انداز میں چلتا اور اس کا انداز بڑا عالمانہ ہوتا۔ لیکن جونہی وہ اظہر کی دہلیز پار کرتا اس کی تمام سنجیدگی غائب ہو جاتی اور وہ بڑے ہنگم طریقہ سے چلنے لگتا۔

لڑکا اس کی آواز سے پہلے اس کی چال کو پہچانتا تھا۔ وہ پہلے درس کیلئے لڑکھڑاتا ہوا آیا اور لڑکے سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ اس کے ننگے ٹخنوں نے لڑکے کو چھوا اور اس کی سخت کھال نے ان کو کھرچا۔ اس کے بعد وہ اس نشست پر بیٹھ گیا کہ جہاں اسے بیٹھنے کی بڑی آرزو تھی۔ استاد کے مقام پر۔

اپنے بہت سے معاصرین کی طرف اس شیخ کو اظہر کے علوم پر بھی بڑا عبور تھا اور وہ روایتی طریق تعلیم پر معترض بھی تھا۔ وہ امام کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوا لیکن وہ کچھ ایسی اس کے دل کو نہ لگیں۔ وہ نہ کوئی مخلص مصلح تھا اور نہ ہی کٹر تھا بلکہ ان دونوں کے بین بین تھا۔ اس سے شیوخ کے ذہنوں میں کچھ شکوک پیدا ہوتے تھے اور وہ اسے کسی حد تک تشویش اور بے اعتباری کی نظر سے دیکھتے تھے۔ فقہہ پر اپنے پہلے ہی درس میں اس نے اعلان کیا کہ وہ ان کو عام طور پر ابتدا میں پڑھائی جانے والی نور الانصیاح کی شرح مراقی الفلاح نہیں پڑھائے گا بلکہ وہ اپنے ہی درس دے گا جو اسی کے معیار کے ہوں گے۔ ان کا فرض تھا کہ غور سے سنیں۔ اچھی طرح سمجھیں اور ضروری نوٹ لیں۔ اس نے پھر اپنا درس شروع کیا جو بہت مفید اور دلچسپ ثابت ہوا۔ گرامر کے درس بھی اسی صورت کے رہے۔ نہ تو اس نے الکفراوی کی شرح پڑھی نہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے کہنے کے نو طریقے

MashalBooks.org

پڑھائے نہ ان کے اعراب بتائے مگر اس نے گرامر کی ٹھوس بنیاد قائم کی۔ فقروں اور لفظوں کی تعریف کی۔ اس، فعل اور حرف کی تشریح کی۔ یہ درس صاف اور دلچسپ تھا۔ اس سہ پہر چائے کے وقت لڑکے سے گرامر اور فقہہ کے متعلق سوالات کئے گئے۔ جب اس نے اپنے بھائی اور اس کے احباب سے جو کچھ سیکھا تھا وہ سنایا تو وہ اس سے بہت مطمئن ہوئے اور انہوں نے شیخ کے طریق تدریس کو سراہا۔ چنانچہ ہر ہفتہ وہ لڑکا ان لیکچروں میں حاضر ہوتا رہا۔ اسے یاد نہیں کہ کب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ مستقل یہ سوچتا رہا کہ اسے اظہر میں باقاعدہ داخلہ کب ملے گا۔ ابھی تک وہ صرف دو لیکچرز سے زیادہ میں باقاعدہ حاضر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک اور درس میں بھی گیا۔ فجر کے بعد حدیث کا درس لیکن یہ صرف وقت گزارنے کیلئے تھا جب تک کہ اس کا بھائی بنیادی اصولوں کے درس کیلئے آتا اور فقہہ کا درس بھی اسی وقت شروع ہوتا تھا۔

آخر کار وہ اہم دن آ گیا۔ فقہہ پر درس کے بعد لڑکے کو تلاوت قرآن کے امتحان کیلئے بلایا گیا۔ جو اظہر میں داخلہ کیلئے ضروری تھا۔ اسے پہلے سے اس کی اطلاع نہیں دی گئی تھی اس لئے اس نے اس کی کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ اگر اسے پہلے سے بتایا جاتا تو قرآن کی ایک دوبارہ خود ہی تلاوت کر لیتا لیکن قاہرہ آنے کے بعد اسے قرآن خوانی کا خیال ہی نہیں آیا۔ چنانچہ جب اسے بتایا گیا کہ ایک گھنٹہ کے اندر اندر اس کا امتحان ہونے والا ہے تو پریشانی سے اس کا دل ہلنے لگا۔ وہ اندھوں کی مسجد کی طرف بڑی پریشانی کے عالم میں دوڑا۔ البتہ جب وہ ممتحنوں کے سامنے آیا تو اس کا خوف ختم ہو گیا اور اس کی جگہ ایک سخت تلخی نے لے لی۔ اس وقت کچھ ایسی بات ہوئی جو وہ کبھی نہ بھول سکا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ دو ممتحن دوسرے طلباء سے فارغ ہو لیں جب اس نے ان میں سے ایک کی آواز سنی جو اتنی کرخت تھی کہ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ ''اب تمہاری باری ہی۔ اندھے لڑکے۔''

اسے کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ الفاظ اس سے کہے گئے تھے اگر اس کا بھائی اس کا ہاتھ پکڑ کر ذرا سختی سے اسے ممتحنوں کے سامنے لے جاتا۔ اس کے گھر والے اس معاملے میں ہمیشہ اس کا لحاظ کرتے تھے اور کبھی اس کے سامنے اس معذوری کا اظہار نہ کرتے۔ وہ ان کی اس مروت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا گو وہ کبھی اپنے اندھے ہونے کو نہ بھولتا اور ہمیشہ اسی کے متعلق سوچتا رہتا۔ یہ صدمہ پہنچنے کے بعد بھی وہ ممتحنوں کے سامنے بیٹھ

گیا جنہوں نے اس سے پہلے سورہ کہف اور سورہ عنکبوت سنانے کو کہا اور کچھ آیات سننے کے بعد ایک ممتحن نے کہا'' کافی ہے، اندھے لڑکے۔تم داخل کر لئے گئے ہو۔''

لڑکا اس امتحان سے بہت پریشان ہوا جو بے معنی تھا اور اس میں حافظہ کا کوئی امتحان نہیں تھا۔اسے کم از کم اتنی توقع تھی کہ بورڈ گرامر میں ضرور اس کا امتحان لے گا جو اس کا باپ گھر پر لیا کرتا تھا۔ وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا لیکن ممتحوں سے سخت غصہ تھا جن کی لاپروائی کو وہ ناقابل معافی سمجھتا تھا۔اندھوں کی مسجد کو چھوڑنے سے پہلے البتہ اس کا بھائی اسے ایک طرف لے گیا جہاں ایک ملازم نے اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا اور اس کی کلائی پر دھاگہ پر لگی ہوئی ایک مہر باندھ دی۔''بس''۔اس شخص نے کہا۔''مبارک ہو۔''

لڑکا اس تعویذ کا مطلب نہ سمجھا۔لیکن اس کے بھائی نے سمجھایا کہ اسے پورے ہفتہ کلائی پر باندھے رکھے جب تک کہ وہ ڈاکٹر سے نہ مل لے جو اس کا معائنہ کرتا۔س کی عمر کا اندازہ لگاتا اور اسے چیچک کا ٹیکہ لگاتا۔

لڑکا کلائی پر بندھے ہوئے اس تعویذ کو پا کر بہت خوش تھا اس لئے کہ یہ اس کی امتحان میں کامیابی کا نشان تھا۔ چنانچہ پہلا مرحلہ ختم ہو گیا سوائے اس کے کہ ابھی تک وہ الفاظ اسے چبھ رہے تھے جو ہفتہ معمول کے مطابق گزر گیا۔ وہ چچا حاجی علی کی آواز پر اٹھتا۔صبح سویرے اظہر جاتا اور فقہہ کے درس کے بعد واپس آتا اور دوپہر کو گرامر کے درس میں شریک ہوتا۔ پھر رات تک اپنے گوشہ میں رہتا۔اگلی صبح موذن کی یہ آواز سنتے ہی وہ اظہر کیلئے روانہ ہو جاتا۔''نماز نیند سے بہتر ہے۔''

طبی امتحان کا دن آیا اور لڑکا بڑا ڈرتا ہوا معائنہ کیلئے آیا۔اسے ڈر تھا کہ ڈاکٹر بھی اسے ممتحن کی طرح ہی بلائے گا لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔اس مرتبہ کوئی بلاوا نہیں آیا۔لڑکے کا بھائی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے اس کے بازو کو پکڑ کر اس پر شگاف لگایا۔''پندرہ''اس نے بس اتنا کہا۔ یوں لڑکا اظہر میں داخل ہو گیا گو ابھی ڈاکٹروں کے مطابق اس کی عمر قواعد کے حساب سے پوری نہیں تھی۔ وہ صرف تیرہ برس کی تھا۔البتہ کلائی سے اس کا تعویذ اتار لیا گیا تھا اور وہ ممتحوں اور ڈاکٹر کے متعلق بہت سے شکوک دل میں لئے گھر چلا گیا۔اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ہنسے یا روئے۔

۱۳

اس طرح کی زندگی صرف اس کیلئے ہی نہیں بلکہ اس کے بھائی کیلئے بھی تکلیف دہ تھی۔ لڑکا اظہر میں اپنی پڑھائی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ نئے مضامین پڑھنا اور نئے درس لینا چاہتا تھا۔ گرامر کے درس کے بعد کمرے میں اس کی تنہائی اس کیلئے نا قابل برداشت تھی۔ وہ چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کو ترستا تھا اور حتیٰ الامکان اس کی کوشش کرتا۔ اس کے بھائی کو بھی صبح شام اسے اظہر لے جانے میں دقت محسوس ہوتی اور اس کو تنہا چھوڑنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا لیکن کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ یہ اس کیلئے ممکن نہیں تھا بلکہ مناسب بھی نہیں تھا کہ وہ ایک طالب علم ہوتے ہوئے اپنے دوستوں کو چھوڑ دے۔ پڑھائی کو ترک کر دے اور گھر میں بھائی کے ساتھ رہے۔

لڑکے نے اپنے یہ خیالات کسی پر ظاہر نہیں کئے نہ ہی کبھی اس کے بھائی نے یہ موضوع چھیڑا گو اس نے کئی مرتبہ اپنے دوستوں کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو ضرور کی۔ پھر ایک رات حالات انتہا کو پہنچ گئے اور لڑکے یا اس کے بھائی کے ایک لفظ بھی کہے بغیر مسئلہ حل ہو گیا۔

ایک روز یہ پوری ٹولی ایک شامی کے گھر مدعو تھی جو اس عمارت بلکہ اس علاقہ میں ہی نہیں رہتا تھا۔ دعوت قبول کر لی گئی تھی۔ دن معمول کے مطابق گزرا۔ سب امام کے درس میں گئے اور دن کی آخری نماز کے بعد کاغذات اور بستے رکھنے کیلئے آئے۔

نوجوان شیخ نے حسب معمول اپنے بھائی کو سونے کے لئے تیار کیا اور جیسا کہ ہر شام کا اس کا دستور تھا وہ چراغ بجھا کر چلا گیا لیکن ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچا ہو گا کہ لڑکے نے خود کو اتنا دکھی محسوس کیا کہ وہ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ غالباً ایک دبی ہوئی سی

MashalBooks.org

سسکی اس کے بھائی کے کان میں پڑ گئی۔ اس نے نہ اپنا ارادہ بدلا نہ وہ دعوت میں جانے سے رکا لیکن حسب معمول تالا لگا کر چلا گیا۔ لڑکا جتنا رو سکتا تھا خوب رویا اور پھر آہستہ آہستہ خود کو سنبھالنے لگا لیکن اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ بھائی کے لوٹنے تک سو نہ سکا اور اس کے بھائی کے آنے سے پہلے ہی صبح ہو چکی تھی۔ وہ پہلے ہی فقیہہ کے درس میں ہو آیا تھا اور جو کچھ کیک وہ پارٹی سے اپنے ساتھ لایا تھا ان سے ناشتہ بھی کر چکا تھا۔ لڑکا اور اس کا بھائی بغیر ایک لفظ بولے ایک دوسرے کے خیالات کو بھانپ گئے تھے۔

دو ایک روز بعد الحاج فیروز نے نوجوان شیخ کو ایک خط دیا۔ اس نے اسے کھولا اور پڑھا۔ پھر لڑکے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑی نرمی اور شفقت سے کہا۔ ''کل سے تم کمرے میں زیادہ دیر اکیلے نہیں رہو گے۔ تمہارا چچا زاد بھائی اظہر میں تعلیم حاصل کرنے آ رہا ہے اور وہ تمہارے ساتھ رہا کرے گا۔''

۱۴

یہ خالہ زاد بھائی اس کے بچپن کا ساتھی تھا اور بڑا اچھا دوست تھا۔ جنوبی علاقہ میں اپنے گاؤں سے وہ اکثر اسے ملنے آتا تھا اور دو ایک مہینے اس کے ساتھ گزارتا تھا۔ وہ ایک ساتھ سکول جاتے اور ایک ساتھ کھیلتے یا قریب جھاڑیوں میں چلے جاتے جو ابراہیمیہ نہر کے کنارے اگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مستقبل کے بہت سے خواب دیکھے تھے اور قاہرہ جانے اور اظہر میں ایک ساتھ پڑھنے کا عہد کیا تھا۔

گرمیوں کے اختتام پر کئی مرتبہ اس کا دوست پیسے اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر گاؤں سے آتا جو اس کی ماں اسے بھیجتی تھی تاکہ وہ قاہرہ جائے اور اپنے خالہ زاد کے ساتھ پڑھے۔ انہوں نے ایک ساتھ انتظار کیا۔ پہلے بے صبری سے پھر جھنجھلاہٹ میں اور آخر دکھ میں۔ بلکہ آنسوؤں کے ساتھ۔ گھر والوں خصوصاً نوجوان شیخ کا خیال تھا کہ ابھی ان کے قاہرہ جانے کا وقت نہیں آیا تھا۔ چنانچہ وہ جدا ہو جائے اور خالہ زاد سخت مایوسی کے عالم میں واپس چلا جاتا۔

چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ اس خبر سے لڑکے کو بہت خوشی ہوئی، اس کی دوپہر بڑی کوشش خوش گزری جس میں وہ آنے والے کل کے متعلق سوچتا رہا۔ شام آئی اور کمرے میں سائے بڑھتے گئے لیکن اس رات اس کمرے میں نہ کوئی آواز تھی نہ کوئی حرکت۔ عین ممکن تھا کہ کیڑے اپنے معمول کے شغل میں لگے ہوئے تھے لیکن لڑکے کو نہ کچھ سنائی دیا نہ محسوس ہوا۔

اس نے جاگ کر رات گزاری اس لئے وہ بہت خوش اور بے قرار تھا۔ وقت بڑی سست رفتاری سے گزر رہا تھا اور وہ بے صبری سے صبح کا انتظار کرتا رہا۔ وہ حدیث کے

MashalBooks.org

درس میں گیا اور شیخ کی آواز کے زیرو بم کو سنتا رہا جو متن اور سند کا فرق بتا تا رہتا تھا لیکن اس نے بالکل توجہ نہیں کی اور اسے کچھ بھی سمجھ نہ آیا۔ پھر وہ فقہہ کے درس میں گیا جس سے وہ غیر حاضر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے بھائی نے شیخ سے اس کا تعارف کرا دیا تھا جو اس سے سوال پوچھتا اور بحث کرتا۔ اس طرح اسے سننا اور سمجھنا پڑتا۔ صبح کے دوران وہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور اگلی ساعتیں سکون اور بیقراری کے ملے جلے احساس میں گزارنے لگا۔

بظاہر وہ پر سکون تھا اس لئے کہ وہ اپنے بھائی یا اس کے دوستوں کو یہ احساس دلانا نہیں چاہتا تھا کہ کسی قسم کی کوئی تبدیلی آئی ہے لیکن اندر ہی اندر وہ اس بات سے پریشان تھا کہ وقت بہت آہستہ گزر رہا تھا اور وہ سہہ پہر کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا جب اس کے خالہ زاد کو قاہرہ کے ریلوے سٹیشن پر آنا تھا۔

آخر موذن نے عصر کی اذان دی اور اب خالہ زاد بھائی سے ملنے میں صرف اتنی دیر تھی جتنی گاڑی کو سٹیشن سے وہاں تک آنے میں لگتی۔ باب البحر اور باپ الشعر سے ہوتے ہوئے پھر پرانے دروازہ کے ساتھ ساتھ جہاں سے ہوتی ہوئی یہ اس راستہ پر مڑتی جہاں ایک طرف حقہ تھا اور دوسری طرف قہوہ خانہ۔

جب ان قدموں کی مانوس چاپ عمارت میں گونجی تو لڑکا اسے فوراً پہچان گیا۔ آخر اس کا بھائی آ پہنچا تھا اس نے بڑے سپاک سے اسے خوش آمدید کہا پھر وہ ایک دوسری کے بوسے لے رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ گاڑی والا کھانے پینے کی چیزیں اور مٹھائیاں وغیرہ لے کر آیا جو گھر والوں نے ان دونوں کیلئے بھیجی تھیں۔ ظاہر تھا کہ آج شام انہیں اچھا کھانے کو ملے گا جس میں دوسرے احباب شامل ہوں گے اور دونوں کو تنہائی میں بات کرنے کا موقع اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک سب امام کے درس میں نہیں چلے جائیں گے۔

ایک اور یقینی بات تھی۔ اس دن سے لڑکے کی زندگی قطعی طور پر اور ہمیشہ بدل گئی اس کی تنہائی اب ایک گزری ہوئی بات تھی۔ اس حد تک کہ کبھی کبھی اس کے کھو جانے کا افسوس بھی ہوتا تھا اور اب وہ اتنی تیزی سے اپنے کام میں لگ گیا کہ کبھی کبھی وہ بری طرح اس کے نیچے دب جاتا۔

۱۵

سب سے زیادہ نمایاں تبدیلی یہ ہوئی کہ اس نے کمرے میں اپنے گوشہ کو چھوڑ دیا جہاں ایک پرانا قالین ایک ٹوٹی پھوٹی چٹائی پر بچھا ہوا تھا۔ کھانا کھانے یا رات کو سونے کے علاوہ اس کو بہت کم استعمال کرتا تھا۔ تقریباً تمام دن اظہر میں گزرتا تھا یا ان دوسری قریبی مسجدوں میں جہاں درس دیئے جاتے تھے۔ جب وہ واپس آتا تو صرف کوٹ اتارنے کے لئے کمرہ میں جاتا اور پھر باہر آ کر دروازے کے سامنے بچھے ہوئے گدے پر اپنے ساتھی کے ہمراہ بیٹھ جاتا۔ یہ گدا آدھے سے زیادہ راستے کو روک لیتا اور زیادہ سے زیادہ ایک دو گز رنے والوں کیلئے جگہ بچتی۔

دونوں لڑکے اپنا وقت باتیں کرتے اور زیادہ تر مطالعہ کرنے میں گزارتے۔ کبھی کبھی وہ نچلی منزل میں ہونے والی کسی بات میں دلچسپی محسوس کرتے اور اٹھ کر اسے دیکھنے جاتے۔ ایک باتیں سنتا اور دوسرا دیکھتا رہتا کہ کیا ہو رہا ہے اور اپنے دوست کو اس کے متعلق بتاتا رہتا۔

یوں لڑکے کو اس جگہ کے متعلق پہلے سے زیادہ واقفیت حاصل ہوگئی۔ وہ یہاں کے رہنے والوں کو بہتر طور پر جان گیا اور ان کے معاملات کے متعلق اس نے اور بہت سی باتیں سنیں۔ البتہ اس کی زندگی کے بہترین اور مفید ترین لمحات اب اس کے دوست کے آنے کے بعد نہ تو کمرے میں گزرتے نہ اس عمارت میں بلکہ زیادہ تر وقت اظہر میں گزرتا۔ اب وہ اپنی تنہائی سے نکل آیا تھا اور زیادہ آزادی محسوس کر رہا تھا۔ فجر کے درس کے بعد لڑکا اپنے کمرے میں آرام کر سکتا تھا اور پھر فقہہ کے درس میں جانے کی تیاری کرتا۔ یوں وہ ہر صبح اپنے دوست کے ساتھ شیخ کی ہکلاتی ہوئی آواز میں نماز سنتا۔ پہلے وہ

MashalBooks.org

اسے جمعہ کے جمعہ سنتا تھا۔لیکن اب اسے روزانہ ہی اس آواز کو سننے کا شوق ہو گیا۔

جب درس کے شروع ہونے کا وقت ہوتا تو وہ اپنے دوست کے ساتھ اسی راستہ سے اظہر جاتا جس سے وہ اپنے بھائی کے ساتھ جایا کرتا تھا لیکن اب وہ راستہ بھر باتیں کرتے اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے جاتے۔ وہ اکثر چھگاڈڑوں سے بھری گندی گلی سے بچ کر نکل جاتے اور شارع خان جعفر کے راستے جاتے جو نسبتاً بہت صاف بھی تھی اور شارع سیدنا الحسین پر نکلتی تھی۔ دوسری تبدیلی یہ تھی کہ اپنے دوست کے آنے کے بعد وہ کبھی مسجد سیدنا الحسین کے آگے سے فاتحہ پڑھے بغیر نہ گزرتا اور اندر داخل ہونے پر تو یہ بہت ہی لازمی تھا۔ یہ عادت جو اس نے اپنے دوست سے سیکھی تھی اس کے ذہن میں رچ بس گئی۔ برس گزر گئے اور اس کی زندگی کا انداز بدل گیا لیکن اسے یاد نہیں کہ کبھی بھی وہ اس مسجد کے سامنے سے قرآن کی پہلی سورۃ پڑھے بغیر گزرا ہو۔

اس کے بھائی نے اس کے اور اس کے دوست کیلئے بہت ہی کم کھانے کا خرچہ مقرر کیا تھا۔ اس کے علاوہ حنفی سیکشن سے روزانہ اپنا اچار روٹیوں کا حصہ بھی لے سکتا تھا۔ دو صبح کیلئے اور دو شام کیلئے۔ گوانہیں بہت ہی تھوڑے پیسے ملتے تھے۔ جو یومیہ ایک پیاستر سے زیادہ نہ تھے۔ انہوں نے کفایت شعاری سے اسے خرچ کرنا سیکھ لیا تھا تا کہ وہ اپنی پسند کی اچھی اچھی چیزیں بھی کھا سکیں۔ کسی کسی دن وہ پرندوں کے ساتھ جاگ اٹھتے تھے اور مقفل دروازے میں بنے ہوئے ایک تنگ سے راستہ سے اظہر کی طرف روانہ ہو جاتے۔ راستہ میں وہ دلیہ کی دکان پر رکتے اور ایک ایک بڑا پیالہ لے لیتے۔ انہیں یہ دلیہ (بلیلا) بہت پسند تھا جو گاؤں میں وہ بڑی کثرت سے کھایا کرتے تھے۔ بڑے بڑے دانوں پر پڑی ہوئی اور ابلتے ہوئے شیرے میں پگھلتی ہوئی شکر انہیں بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے لگتے ہی نیند اڑ جاتی تھی۔ ان کے منہ اور ان کی معدے میں سے خوشگوار گرمائی کی ایک لہر اٹھتی جو ان کے سارے جسم کو تقویت پہنچاتی۔ فقہہ کے درس میں جانے کیلئے یہ بڑا اچھا نسخہ تھا۔ اب وہ جسم اور دماغ کی پوری توانائی کے ساتھ شیخ کا درس سن سکتے تھے۔

وہ اتنے نادرا بھی نہیں تھے کہ ذرا سا مڑ کر شارع سیدنا الحسین میں جا کر کھانے کی دوکان کے سامنے بینچ پر نہ بیٹھ سکتے۔ لکڑی کے سخت تختے پر چٹائی ہو یا نہ ہو یہ انہیں ابر

ریشم کی طرح نرم لگتا تھا۔ بھیگی ہوئی انجیروں کے پیالہ کا انتظار کس قدر خوشگوار تھا۔ وہ بڑی بے صبری سے اسے کھا جاتے اور شیرہ پی لیتے۔ پھر کچھ عرصہ خاموشی سے تہہ میں بیٹھی ہوئی کشمش کھاتے۔

ان کے پاس اب بھی اتنے پیسے ہوتے کہ وہ صبح شام گھر لوٹتے ہوئے مٹھائی کی دکان پر رکتے اور ہریسے یا بسسے (کیک) کے اپنے بے ضرر شوق کو پورا کرتے اور ان کی بھوک بھی خراب نہ ہوتی۔

دوپہر کا کھانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کیلئے انہیں ابلے ہوئے لوبیے کی دکان پر جانا ہوتا جو وہ دو چار روٹیوں کے ساتھ کما لیتے۔ اس کی کھیر کے دو حصہ ڈھائی یلم میں ملتے۔ ادھی یلم میں وہ ایک دو پیاز کے گٹھے خرید لیتے۔ دوکاندار انہیں لوبۓ کے سوپ کا ایک بڑا پیالہ لا دیتا جس میں ذائقہ کیلئے کچھ تیل بھی ڈلا ہوتا۔ وہ سوپ میں روٹی ڈبوتے اور اس سے لوبۓ کو پکڑنے کی سخت کوشش کرتے اور دوسرے ہاتھ سے پیاز کے گٹھے سے نبرد آزما رہتے۔ روٹی اور پیاز کے ختم ہوتے ہوتے ان کا پیٹ بھر جاتا بلکہ کچھ زیادہ ہی بھر جاتا لیکن پیالہ میں کچھ شوربا بچ جاتا۔ پہلے تو لڑکا کچھ شرمایا لیکن جب اس کے دوست نے اصرار کیا تو وہ اس نے پی لیا اور پیالہ لوٹا دیا۔

یوں ان کو کھانا تین یلم سے زیادہ نہیں پڑا۔ درس سے پہلے جو کچھ انہوں نے کھایا وہ اس کے علاوہ تھا۔ اب بس اظہر جا کر دماغوں کو بھی ایسے ہی بھرنا تھا جیسے انہوں نے پیٹ بھرے تھے۔ لڑکا بہت محتاط تھا اور گرامر اور فقہہ کے درس سے کبھی غیر حاضر نہ ہوتا۔ شیخ نیم مصلح، نیم قدامت پرست تھا۔ لڑکا صرف بھائی کے ڈر سے ہی نہیں بلکہ خود اپنے اطمینان کیلئے یہ درس لیتا لیکن وہ دوسرے استادوں کو سننے اور دوسرے مضامین کے پڑھنے کا بھی مشتاق تھا۔ اس میں اب اسے زیادہ دقت نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ یہ درس دیر میں ہوتے تھے جب لڑکے دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر آجاتے تھے۔ دونوں دوستوں نے طے کیا کہ شرح الکفراوی کے درس میں جائیں۔ جو اس وقت ایک شیخ دیتا تھا جو ابھی تحصیل علم سے فارغ ہوا تھا۔ حالانکہ اظہر سے وہ بہت عرصہ سے وابستہ تھا۔ وہ کافی عمر رسیدہ تھا اور سند حاصل کرنے میں اس نے کئی برس لگائے تھے۔ جسے حاصل کرنے کے بعد اب اس نے معمول کے مطابق الکفراوی کی شرح پڑھنی شروع کر دی تھی۔

MashalBooks.org

لڑکے نے اپنے اساتذہ اور اپنے بھائی کے دوستوں سے اس شرح کے خلاف بہت کچھ سنا تھا لیکن جتنا جتنا وہ اس میں نقص نکالتے اتنا ہی اس میں اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی۔ پہلے درس میں جانے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو پڑھنے کے نو طریقے وغیرہ سیکھنے سے کوئی اسے نہیں روک سکتا تھا۔ حقیقت میں وہ اس شعبہ علم کا گرویدہ ہو گیا تھا اور وہ اور اس کا دوست اس درس میں بھی اس باقاعدگی سے حاضر ہونے لگا جیسے دوسرے کسی درس میں۔ تاہم یہ اس پر واضح ہو گیا تھا کہ گرائمر وہ دوسرے ہی درس میں سیکھتا تھا یہاں اسے صرف ہنسی ہی آتی تھی۔ یہ نیا درس واقعی بہت مزے کا تھا اس لئے کہ شارح کی گردان کبھی ختم ہی نہ ہوتی اور اس سے بھی زیادہ شیخ کی مضحکہ خیز آواز میں کتاب پڑھنے اور اس پر تبصرہ کرنے پر بہت ہنسی آتی وہ پڑھتا نہیں تھا، گاتا تھا اور آواز اس کے سینہ سے نہیں بلکہ اس کے سر سے آتی ہوئی معلوم ہوتی۔ اس کی آواز میں دو متضاد خصوصیات تھیں۔ یہ سپاٹ بھی تھی اور گمبھیر بھی۔ گھٹی ہوئی اور بلند بھی۔

وہ بالائی مصر کا رہنے والا تھا، دور جنوبی علاقہ سے اور اس نے بغیر کسی تبدیلی کے علاقائی بولی کو برقرار رکھا تھا۔ بولتے ہوئے بھی، پڑھتے ہوئے بھی تلاوت کرتے ہوئے بھی۔ وہ بہت تیز مزاج تھا اور چاہے وہ پڑھ رہا ہو یا سوال پوچھ رہا ہو یا اعتراضات کے جواب دے رہا ہو اس کا انداز گفتگو اسی طرح تند رہتا۔ اسے بہت جلد غصہ آ جاتا اور اس سے سوال کرنا اس کے ہاتھ ذلیل ہونا تھا۔ اگر کوئی جواب پر اصرار کرتا تو وہ قریب ہوتا تو اس کو ضرور گھونسا پڑ جاتا اور اگر دور ہوتا تو وہ اسے جوتا پھینک کر مارتا۔ شیخ کا جوتا بھی اتنا ہی بڑا تھا جتنی اس کی آواز۔ اور یہ دونوں اتنے ہی بے ڈھب تھے جتنا اس کا لباس۔ وہ اوور کوٹ نہیں پہنتا تھا بلکہ اس کی جگہ موٹے سے کپڑے کا ایک چوغہ ہوتا تھا اور جوتے کے تلے میں کیلیں لگی ہوتیں کہ جلدی ٹوٹے یا گھسے نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے منہ پر پڑنے کا کیا مطلب ہوتا یا کہیں بھی پڑتا یہ اتنا ظالم جوتا تھا

یہی وجہ تھی کہ لڑکے سوال کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور چاہے شیخ پڑھ رہا ہوتا تشریح کر رہا ہوتا تنقید کر رہا ہوتا یا لے میں پڑھ رہا ہوتا کوئی بیچ میں نہ بولتا۔ اس لئے نہ کبھی اس کا وقت ضائع ہوتا تھا اور نہ ہی طالب علموں کا۔ وہ تعلیمی سال کی ابتداء الکفراء کی شرح سے کرتا اور سال کے آخر تک شیخ خالد کی کتاب بھی ختم کر دیتا۔ یوں اس کے ایک سال

میں دو کتابیں پڑھ لیتے جب کہ دوسرے شیخ ایک سے زیادہ کتاب نہ پڑھا پاتے۔ جہاں تک ہمارے اس قدامت پرست آزادمنش کا تعلق ہے وہ اپنے شاگردوں کی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ گرائمر کے شروع کے چند ابواب سے آگے نہ جا سکا۔

لڑکے کی گرامر کی تعلیم پر ان تمام باتوں کا اثر ہوا اگر اسے اثر کہا جا سکتا ہے جب وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر قاہرہ واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ قدامت پرست آزادمنش وہاں نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے ایک اظہری کی طرح کام شروع کیا۔فقہ پر اس نے کینز پر طائی کی شرح پڑھی اور گرامر میں الزہریہ کی شرح پر العطار کے نوٹ۔لیکن آنے والی باتوں کے بجائے ہم لڑکے کے پہلے سال کی بات کرتے ہیں۔

صبح کے درس کے بعد وہ دوپہر کے درس میں جاتا اور پھر اگلے روز کے درس کی تیاری کے لئے اپنے دوست کے ساتھ گھر آ جاتا۔ جب کہ سنجیدہ طلباء کا قاعدہ تھا یا مختلف کتابوں سے اقتباسات نقل کرتا۔ چاہے وہ اس کی سمجھ میں آتے ہوں یا نہ آتے ہوں۔ جونہی سورج روبہ زوال ہوتا دونوں دوست کھانے کی طرف دھیان کرتے اور جتنے پیسے ان کے پاس ہوتے اس کے مطابق ان کی طبیعت کا بوجھ کم ہوتا اور مسرت کا احساس ہوتا۔ اگر ان کے پاس ایک پیاسترباقی ہوتا تو وہ اس کے دو حصہ کرتے ایک چوتھائی سے کچھ حلوہ خریدتے اور دوسری سے کچھ یونانی پنیر۔ یوں اچھا خاصا کھانا بن جاتا۔ وہ ایک ہی لقمہ میں تھوڑا سا حلوہ اور تھوڑا سا پنیر لیتے اور انہیں یہ بڑے مزے کا لگتا۔لیکن اگر وہ کچھ پیسے بلیلا یا انجیروں پر خرچ کر دیتے تو پھر صرف ایک چوتھائی پیاستر بچتا۔اس صورت میں وہ تھوڑا سا تلوں کا حلوہ لیتے جس پر گاؤں سے آیا ہوا کالا یا سفید شہد ڈال لیتے۔ یہ بہت اچھا کھانا تو نہ ہوتا بہرحال نہ ہونے سے بہتر تھا۔

البتہ کبھی کبھی بلیلا یا انجیروں پر وہ تمام پیسے خرچ کر دیتے اور ان کے پاس کچھ نہ بچتا لیکن کوئی بات نہیں ان کے پاس ابھی دو روٹیاں تھیں اور کمرے میں دو ڈبے تھے۔ ایک سفید شہد کا اور ایک سیاہ شہد کا وہ کچھ شہد لے کر روٹیاں اس میں ڈبو لیتے اور حلوہ وغیرہ کی عیاشی کے بجائے اسی پر گزارہ کرتے۔اس روکھی روٹی کو وہ کبھی سفید اور کبھی سیاہ شہد میں ڈبو کر اچھا خاصا مزے کا کھانا بنا لیا کرتے۔

اب سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا اور جلد ہی موذن مینار پر چڑھنے والا تھا۔

دونوں لڑکوں کو فوراً ازہر کے لئے روانہ ہونا تھا۔ بڑی عمر کے طلباء کی طرح وہ بھی شام کے درس میں شامل ہوتے یہ منطق کا درس تھا جس میں الاخضری کی کتاب ''سلام'' پڑھائی جاتی تھی۔ معلم ایک شیخ تھا جو خود کو بڑا عالم سمجھتا تھا لیکن جس کی علمیت کو اظہر نے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ برسوں زیرِ تعلیم رہا اور سند حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی اس نے ہمت نہیں ہاری اور نہ کبھی ممتحوں کے فیصلہ کو قبول کیا چنانچہ وہ اس سے تنگ آ گئے۔ وہ مسلسل درس میں حاضر ہو کر اور ہر سال امتحان میں بیٹھ کر ان کے لئے کوفت کا باعث ہوتا لیکن جس بات سے انہیں سخت غصہ آتا تھا وہ اس کا مغرب کی نماز کے بعد کچھ شاگردوں کے حلقہ میں ستون کے ساتھ بیٹھ کر انہیں منطق کی کتاب پڑھاتا تھا۔ گویا وہ بھی ایک شیخ تھا۔ اس لئے کہ منطق وہ موضوع تھا جس پر جید علماء ہی ہاتھ ڈالنے کی جسارت کر سکتے تھے۔

یقیناً یہ طالب علم شیخ نہ پڑھنے کا اہل تھا نہ پڑھانے کا، مبتدی بھی اس کی جہالت اور نااہلی کو جان لیتے تھے۔ وہ بھی بالائی مصر کے دور ترین علاقہ سے آیا تھا اور اس کی بولی اب بھی ویسی تھی جیسی اس وقت تھی جب وہ اظہر آیا تھا۔ اس کا پڑھنے یا گفتگو کرنے کا انداز بالکل نہیں بدلا تھا۔ اس کے علاوہ اسے بہت جلد غصہ آ جاتا تھا اور وہ غصہ میں پاگل ہو جاتا یہ نہیں کہ وہ طالب علموں کی بے عزتی کرتا تھا یا ان کی پٹائی کرتا تھا وہ حقیقی علماء کی جگہ نہیں لینا چاہتا تھا جنہیں سند حاصل کرنے کے بعد ایسی باتوں کی آزادی تھی۔

ہوسکتا ہے ہے کہ یہ سب کچھ صحیح ہو دونوں لڑکوں کو دوسروں نے یہی بتانا تھا مگر اس وجہ سے وہ اس درس میں آنے سے باز نہ رہے۔ چنانچہ وہ یہ باور کرا سکے کہ فقہہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اعلیٰ درجوں کے طلباء کی طرح شام سے رات اک اظہر میں درس لیتے تھے۔

پہلا سال برق رفتاری سے گزر گیا اور گرامر اور فقہہ کے نصاب جلد ختم ہو گئے جلد ہی طلباء رخصت ہو جائیں گے اور اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔ لڑکا اس طویل تعطیل کا کتنی بیزاری سے انتظار کر رہا تھا اور اسے گاؤں اور اپنا گھر کتنا یاد آ رہا تھا لیکن اب واقعی چھٹیاں آ گئی تھیں تو وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی روانگی کچھ دیر کے لئے ملتوی ہو جائے اور وہ مزید وقت قاہرہ میں گزارے۔ کیا واقعی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں

ٹھہرے یا اس کی کچھ اور وجوہات تھیں؟ ہاں بھی اور نہیں بھی۔

قاہرہ سے واقعی اسے لگاؤ تھا اور اب جب کہ وہ اس سے اتنا مانوس ہو گیا تھا تو اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس کے علاوہ سفر اسے کبھی بھی پسند نہیں تھا لیکن اس وجہ سے بھی وہ وہاں ٹھہرنا چاہتا تھا کہ اس کا بھائی زیادہ تر چھٹیاں قاہرہ میں گزارتا تھا اور اس کے عزیز واقارب اس سے بہت متاثر تھے جسے وہ اس کی علم دوستی پر محمول کرتے تھے لڑکا بھی ایسا ہی کرنا چاہتا تھا جیسا اس کے بھائی کا طریقہ تھا تاکہ اسکے متعلق بھی لوگ اچھے خیالات رکھیں لیکن اس تمام عاجزی اور انکساری کا کوئی فائدہ نہیں ہوا ایک روز اسے اور اس کے ساتھ کو کپڑوں کی ایک گٹھڑی کے ساتھ گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ اسٹیشن پر انہیں ٹکٹ پکڑائے گئے اور کھچا کھچ بھرے ہوئے تیسرے درجہ کے ایک ڈبہ میں انہیں ٹھونس دیا گیا گاڑی روانہ ہوئی اور چند ہی سٹیشن گزرنے کے بعد وہ قاہرہ کو بھول گئے اظہر کو بھول گئے اپنی رہائش گاہ کو بھول گئے انہیں بس ایک ہی چیز کا خیال تھا اور وہ تھا ان کا گھر اس کی خوشیاں اور ہنگامے۔

MashalBooks.org

۱۶

لڑکے جب گاڑی سے اترے تو رات پڑ چکی تھی اور انہیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ کوئی بھی انہیں لینے سٹیشن پر نہیں آیا تھا وہ گھر کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔

گھر والے کافی پہلے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور لڑکے کا باپ نماز پڑھنے کے بعد حسب دستور اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگانے کے لئے گھر سے باہر جا چکا تھا۔ بچے اونگھ رہے تھے اور ان کی چھوٹی بہن ایک ایک کو اٹھا کر بستر پر لٹا رہی تھی لڑکے کی ماں ستاروں کی چھاؤں تلے ایک نرم گدے پر لیٹ گئی تھی اور غنودگی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی جب کہ اس کی بیٹیاں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں اور جیسا کہ ان کا معمول تھا جب تک ان کا باپ گپ شپ سے واپس نہ آ جاتا وہ بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔ پھر گھر کے سب لوگ بستروں میں چلے جاتے اور گھر خاموشی میں ڈوب جاتا جو صرف کتوں کے بھونکنے اور مرغوں کے اذان دینے کی آوازوں سے ٹوٹتی جو کبھی گھر کے اندر سے آتیں کبھی باہر سے۔

لڑکے کی آمد سے گھر والے سخت حیران ہوئے ان کے واپس آنے کی کوئی پیشگی اطلاع نہیں تھی اس لئے ان کے واسطے کوئی خاص کھانا تیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کے لئے کھانا بچا بھی نہیں تھا۔ سٹیشن پر بھی کوئی انہیں لینے نہیں گیا تھا ان باتوں سے لڑکے کا دل ٹوٹ گیا اور اس نے عزیزوں کی محبت کے متعلق جو تصور باندھے تھے ان سے مایوسی ہوئی اسے خیال تھا کہ اس کا بھی ایسے ہی خوشی خوشی اور پرتپاک استقبال کیا جائے گا جیسے اس کے بھائی کا کیا جاتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی ماں اسے پیار کرنے اٹھی اور بہنوں نے اسے

گلے لگایا لیکن پھرلڑکا اور اس کا ساتھ ایسے ہی خاموشی سے کھانا کھانے لگے جیسے وہ قاہرہ میں کھانا کھاتے تھے۔

اس کا باپ گھر آیا اور بوسہ دینے کے لئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے کے بعد پوچھا کہ قاہرہ میں اس کا بھائی کس حال میں ہے۔ جلد ہی سب گھر والے سو گئے۔ لڑکا اپنے پرانے بستر میں ہی سویا لیکن اس کا دل دکھا ہوا تھا۔ غصہ اور مایوسی کو ضبط کرنے کی اس نے ازحد کوشش کی۔

اس کے بعد گاؤں میں اور گھر میں زندگی اسی نہج پر چلتی رہی جیسی اظہر میں اس کی تعلیم کے لئے قاہرہ جانے سے پہلے۔ لگتا تھا جیسے وہ کبھی قاہرہ گیا ہی نہیں یا شیخ صاحبان کے درس میں شریک ہی نہیں ہوا۔ نہ اس نے فقہہ پڑھی نہ گرامر۔ نہ منطق نہ حدیث۔ پہلے کی طرح اب بھی سکول کے استاد کے ہاتھ چومنا۔ اس کا احترام کرنا اور اس کی مسلسل بکواس سننا اس کا مقدر تھا وقت گزارنے کے لئے کبھی کبھی اسے مدرسہ بھی جانا پڑتا طلباء کا رویہ اس کے ساتھ پہلے کی طرح کا ہی تھا۔ ان پر اس بات کا کوئی اثر نہیں تھا کہ وہ اتنے عرصہ باہر رہا تھا اور اس نے قاہرہ میں کیا دیکھا کیا سنا اس کی تو انہیں کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ تاہم اگر وہ کچھ پوچھتے تو ان کے پاس بتانے کے لئے بہت کچھ ہوتا۔

سب سے سخت بات یہ تھی کہ گاؤں کے ایک دوست نے بھی نوجوان طالب علم کی خبر نہیں لی حالانکہ وہ پورے سال غیر حاضر رہا تھا بس اتنا ہوا کہ دو ایک لوگ اسے ذرا نیم گرمجوشی سے ملے۔ تم یہاں ہو۔ قاہرہ سے لوٹ آئے! اب کیسے ہو۔ پھر اپنی آوازوں کو بلند کرتے ہوئے۔ وہ بڑے ہمدردانہ لہجے میں پوچھتے۔ ''اور تم نے اپنے بڑے بھائی کو کس حال میں چھوڑا۔'' لڑکے کو باور کرانے کے لئے اتنا بہت تھا کہ قاہرہ جانے سے پہلے وہ جیسا تھا اب بھی ویسا ہی تھا۔ معمولی سا۔ غیر اہم انسان۔ نہ کسی توجہ کے لائق نہ کسی طرح سے دلچسپ۔ اس سے اس کی انا کو چوٹ لگی اور وہ اپنے خول میں سمٹ گیا یہاں تک کہ وہ سخت خود پسند اور بیزار ہو گیا ابھی گھر آئے اسے چند روز ہی ہوئے تھے کہ لوگوں کے کے خیالات اس کے متعلق بدلنے لگے ان کی لاتعلقی ہمدردی یا شفقت میں بدلنے کی بجائے ان کی مکمل نفی ہو گئی چنانچہ گاؤں میں اس کے ہمسایوں کا رویہ ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

آخر کار وہ اس کی برداشت سے باہر ہو گئے۔ اس نے تابعداری کی پرانی عادت چھوڑ دی اوران کے خلاف بغاوت کر دی جن کی وہ اطاعت کرتا تھا۔شروع شروع میں وہ خاصا معقول تھا لیکن جب اس کی باتوں کو پسند نہیں کیا گیا اوراس کی مخالفت کی گئی تو اس نے ڈٹ کر ہر بات کی مخالفت کرنی شروع کر دی۔ ایک دن اس نے سکول ماسٹر اور اپنی ماں کی گفتگو سنی۔ وہ مذہب اور دینیات میں روایت کی بات کر رہے تھے اور شیخ حافظ قرآن کی تعریف کر رہا تھا جنہیں کتاب مقدس زبانی حفظ تھی۔ اس کی باتوں سے لڑکا ناراض ہو گیا جو ضبط نہ کر سکا اور بیچ میں کود پڑا اور ایسی باتوں کو''حماقت اور بکواس'' کہنے لگا۔سکول ماسٹر کو سخت غصہ آیا اور وہ لڑکے پر برس پڑا اوراس کی سخت بےعزتی کی۔ اس نے کہا کہ قاہرہ میں تم نے جو کچھ سیکھا ہے سب بدکرداری ہے۔تم نے اچھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا۔

اس کی ماں نے بڑے غصہ میں اسے برا بھلا کہا اور سکول ماسٹر سے اس کی طرف سے معافی مانگی۔ جب اس کا باپ نماز اور کھانے کے لئے واپس آیا تو اس کی ماں نے اسے یہ واقعہ سنایا۔اس نے صرف گردن ہلائی اور ایک تمسخر کے ساتھ سارے مسئلہ کو رد کر دیا۔اس کے اور سکول ماسٹر کے درمیان کوئی خوشگوار تعلق نہیں تھا۔

اگر معاملہ یہیں ختم ہو جاتا تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا لیکن ایک دن ہمارے دوست نے اپنے باپ کو''دلائل خیرات'' بلند آواز سے پڑھتے سنا۔صبح اور شام کی نمازوں میں۔ جس پر لڑکا شانے پھڑکانے اور سر ہلانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بہنوں کے سامنے کھل کر ہنس بھی نہیں سکتا تھا۔اس نے کہا کہ''دلائل خیرات'' کو پڑھنا ایک احمقانہ تصنع اوقات ہے۔

اس کے چھوٹے بہن بھائیوں کو البتہ یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور انہوں نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا لیکن اس کی بڑی بہن نے اسے بری طرح جھاڑا اور وہ اتنی زور سے بولی کہ اس کے باپ نے بھی سن لیا۔اس نے اپنی تلاوت روکی نہیں لیکن جونہی تلاوت ختم ہوئی وہ زیرلب مسکراتا ہوا لڑکے کے پاس آیا اوراس سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔لڑکے نے جواب دیا کہ ہاں میں یہی پڑھا ہے اور میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ کافی حد تک گناہ ہے اوراس میں فلاح سے زیادہ ہلاکت

ہے۔انسان کو فرشتوں یا ولیوں سے مدد نہیں مانگنی چاہئے نہ اس کا یہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ خدا اور بندوں کے درمیان کوئی واسطہ ہوسکتا ہے یہ صنم پرستی ہے۔

بوڑھے کو بڑا غصہ آیا لیکن وہ ضبط کرتا رہا اور ہنستا رہا۔اس کے جواب پر سب گھر والوں نے قہقہہ لگایا۔''خاموش رہو۔تمہاری زبان ٹوٹے آئندہ ایسی گفتگو نہ کرنا۔ ورنہ یاد رکھو میں تمہیں یہیں گاؤں میں رکھ لوں گا۔ اظہر میں تمہاری تعلیم ختم کرا دوں گا اور تمہیں قرآن خواں بنا دوں گا اور پھر تم موت اور خاندانی تقریبات پر قرآن خوانی کیا کرو گے'' پھر وہ مڑا اور چلا گیا اور گھر والے قہقہے لگاتے رہے۔ یہ ڈانٹ۔کیسی ہی سخت اور تلخ کیوں نہ ہو اس کی وجہ سے لڑکے کا عزم اور حوصلہ ٹھنڈا نہ ہوا اور وہ ویسے ہی اپنی بات پر اڑا رہا۔

بڑھا چند گھنٹوں میں اس واقعہ کو بھول گیا اور جب وہ اپنے بیٹوں بیٹیوں کے ساتھ کھانے کے لئے بیٹھا تو حسب معمول اس نے لڑکے سے قاہرہ میں اس کے بھائی کے متعلق باتیں شروع کر دیں وہ کیا کر رہا تھا؟ کون سی کتابیں پڑھتا تھا؟ کس کس درس میں جاتا تھا۔

شیخ کو ایسے سوالات سے بڑی مسرت ہوتی تھی اور وہ اس کے جواب بڑے غور سے سنتا تھا۔ جب نوجوان شیخ گھر آتا تو وہ اس سے بھی یہی سوال پوچھتا لیکن پہلے تو بھائی اس سوالوں کے جواب دینے سے گھبراتا تھا اور بعد میں یا تو انہیں ٹال دیتا تھا یا سرسری سے جواب دے دیتا۔اس کا باپ اس خاموشی پر کسی ناراضگی کا اظہار نہ کرتا گو اندر ہی اندر اسے بہت دکھ ہوتا اور تنہائی میں اپنی بیوی سے اس کا گلہ کرتا۔

لڑکا البتہ خاموش رہنے یا جواب نہ دینے کے بجائے بہت فرمانبرداری سے پیش آتا۔اس کا باپ چاہے کتنی بار یہ سوال کرتا اور کتنے ہی موضوعات چھیڑتا لڑکا کبھی کسی جھنجھلاہٹ کا اظہار نہ کرتا۔یہی وجہ تھی کہ اس کے باپ کو اس سے باتیں پوچھنے میں مزا آتا تھا اور وہ کھانے کے اوقات میں اس سے سوالات کرتا رہتا اور کبھی کبھی وہ اپنے دوستوں کو بتاتا کہ لڑکے کے بیان کے مطابق نوجوان شیخ کیسے اپنے اساتذہ سے ملتا رہتا اور امام یا شیخ بخیت سے کس کس طرح گفتگو کرتا یا کس طرح وہ درس کے دوران سوالات پوچھ کر اپنے اساتذہ کو پریشان کرتا اور پھر ان کا غصہ اور جھڑکیاں حتیٰ کہ ایسی باتوں پر ان کی مار

کے قصے سناتا۔

لڑکے کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا باپ ان قصوں کو بڑے شوق سے سنتا تھا۔ چنانچہ وہ اسے خوب کہانیاں سناتا بلکہ کچھ کہانیاں گھڑ بھی لیتا لیکن وہ ان فرضی قصوں کو ذہن میں رکھتا تاکہ قاہرہ پہنچ کر اپنے بھائی کو ان کے متعلق بتا سکے۔

ان باتوں سے بڈھے کی بڑی طمانیت محسوس ہوتی اور وہ مزید باتیں سننے کا مشتاق ہوتا۔ چنانچہ اس شام جب گھر کے سب لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو شیخ نے پھر وہی سوال دھرائے کہ اس کا بیٹا قاہرہ میں کیا کر رہا ہے۔ کون سی کتابیں پڑھ رہا ہے اور لڑکا بڑی ہوشیاری اور عیاری سے جواب دیتا کہ وہ بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دیتا ہے اور دلائل الخیرات پڑھنے میں مصروف رہتا ہے اس جواب پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑتے، چھوٹے بچے، جن کے منہ بھرے ہوتے۔ ان کا تو سانس ہی رک جاتا اور بڈھا تو سب سے زیادہ اور سب دیر تک قہقہے لگاتا رہتا۔

یوں ''دلائل الخیرات'' کے پڑھنے پر اپنے باپ کو لڑکے کا جواب بہت عرصہ تک ایک خاندانی مذاق بنا رہا تاہم بڈھے کو حقیقت میں اس سے بہت کوفت ہوتی تھی اس لئے کہ یہ بات اس کی عادات اور عقائد کے خلاف تھی لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ اس سب کے باوجود وہ اپنے بیٹے کو اپنے آپ پر تنقید کرنے پر اکساتا تھا اور اس شکست میں ایک لطف محسوس کرتا تھا۔

بہر حال لڑکے کی یہ جدت طرازی اور چیزوں میں بھی ظاہر ہونے لگی۔ گھر سے باہر اپنے باپ کی باتوں میں۔ شیخ محمد عبدالواحد کے مکان پر۔ اس مسجد میں جہاں شہر کے رئیس الفقہہ شیخ محمد ابواحد لڑکوں اور نوجوانوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ نمازوں کی امامت کرتے تھے اور کبھی کبھی دینیات کا درس دیتے تھے یا شیخ عطیہ کے حلقہ میں جو خود ان تاجروں میں سے تھا جنہوں نے کئی سال اظہر میں تعلیم حاصل کی تھی اور واپس آ کر دنیاوی کاروبار میں لگ گئے تھے مگر جنہوں نے مذہبی معاملات کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ مسجد میں درس و تدریس کرتے تھے اور کبھی کبھی احادیث بھی بیان کرتے تھے۔

لڑکا اس شوق تنقید کو محکمہ شریفہ تک بھی لے گیا جہاں قاضی بھی اس سے مانوس ہو گیا اور وہ شیخ بھی جو قاضی کا سیکرٹری تھا۔ اسے پتہ لگا کہ یہ شخص قاضی سے بھی زیادہ

شریعت واقف تھا۔ دینیات میں اس سے زیادہ فاضل ہے اور اس کے فیصلے بہت معتبر ہیں۔فرق یہ تھا کہ ابھی اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا حاصل نہیں کیا تھا جسے سند کہتے ہیں جو قاضی بننے کے لئے نہایت ضروری ہے اور جو محنت کے بجائے اکثر خوشامد یا قسمت سے ہی ملتی ہے۔

یہ تمام لوگ لڑکے کے خیالات سے واقف ہو گئے انہیں معلوم تھا کہ وہ ان کی علمیت کا مذاق اڑاتا تھا۔ ولیوں کی کرامات پر ہنستا تھا اور ان کو انسانوں اور خدا کے درمیان واسطہ بنانے کے خلاف تھا۔ وہ کہتے تھے یہ ایک بھٹکا ہوا لڑکا ہے جو ہمارا ایمان بھی خراب کرنا چاہتا ہے وہ قاہرہ تک گیا ہے اور اس نے شیخ محمد عبدہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہے اور اس کے خطرناک عقائد کو اپنا لیا ہے اور اب وہ یہاں گاؤں کے لوگوں کو ورغلانے اور انہیں گمراہ کرنے آیا ہے۔

کبھی کبھی وہ ایک لوگ شیخ کے گھر باہر بیٹھک میں آتے اور اس کے سر پھرے بیٹے سے ملنے کی خواہش کرتے بوڑھا ایک متین مسکراہٹ کے ساتھ گھر کے اندر جاتا جہاں لڑکا کھیل رہا ہوتا یا اپنی بہنوں کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوتا۔نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے باہر لے جاتا اور ان لوگوں کے سامنے پیش کرتا اور ان کے درمیان بٹھا دیتا۔ پھر ان میں سے ایک لڑکے کے ساتھ بحث شروع کر دیتا پہلے گفتگو بہت ہی دھیمے انداز میں ہوتی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں جھگڑے کا سا انداز اختیار کر لیتی۔ اکثر یوں ہوتا کہ بحث کرنے والا سخت غصہ میں وہاں سے جاتا اور خدا سے دعائیں کرتا جاتا کہ وہ اس کے کفر کو معاف کرے اور سب کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔

بوڑھا اور اس کے وہ دوست جنھوں نے اظہر میں تعلیم نہیں پائی تھی یا دینیات کا کچھ مطالعہ کیا تھا ان بحثوں سے بہت حیران اور محظوظ ہوتے اور اس لڑکے اور سفید ریش بزرگوں کے درمیان جھگڑوں کا خوب مزہ لیتے۔

لڑکے کا باپ بھی ان بحثوں کا اتنا ہی لطف لیتا حالانکہ وہ اس کے خیالات سے قطعی متفق نہیں تھا اسے انبیاء اولیا کے واسطہ ہونے میں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آتی تھی۔ نہ ہی اسے اس میں کوئی شک تھا کہ ولی اللہ لوگ کرامات کے اہل تھے لیکن اسے اپنے بیٹے کو بحث کرتے اور دوسروں کو قائل کرتے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ کھل کر

اس کی طرفداری کرتا۔ لوگ اس کے بیٹے کے متعلق جو باتیں بناتے تھے اور اکثر من گھڑت ہوتیں انہیں وہ بڑے غور سے سنتا۔ جب وہ سہ پہر یا شام کو گھر لوٹتا تو اپنی بیوی کو یہ باتیں سناتا۔ کبھی فخر سے اور کبھی غصہ سے۔

یوں حالات یکسر بدل گئے اور لڑکا اپنی اکھڑ تنہائی سے نکل آیا صرف گاؤں ہی نہیں بلکہ پورا قصبہ اس کی باتیں کرتا اس کے متعلق رائے دیتا اور گھر میں اس کی حیثیت، اس کی اہمیت قطعی طور پر بدل گئی۔ اس کا باپ اب اسے نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ اسکی ماں اور بہن بھائی اب اس سے لاتعلق نہیں رہتے تھے اور ان سے اس کا رشتہ اب رحم اور ہمدردی کا نہیں رہا تھا۔ بلکہ اس کی بنیاد اب زیادہ معتبر زیادہ اطمینان بخش تھی۔

چھٹیوں کے شروع میں جو اسے تنبیہہ کی گئی تھی اب اس کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اب گاؤں میں اس کے ٹھہرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اب اسے یہ خطرہ نہیں تھا کہ اس کی تعلیم ختم ہو جائے گی اور وہ ایک فقیہہ بن جائے گا جو فوتگی اور گھریلو اجتماعات قرآن خوانی کرے گا ایک روز وہ صبح سویرے اٹھا اور اس کے ساتھ ہی گھر کے سب لوگ بھی اٹھ گئے جلد ہی وہ ماں کے بازوؤں میں تھا جو اسے پیار کر رہی تھی خدا حافظ کہہ رہی تھی اور چپکے چپکے رو رہی تھی۔ اب وہ اپنے ساتھی ہمراہ سٹیشن پر تھا اور اس کا باپ احتیاط سے اسے سوار کر رہا تھا۔ اس کے باپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ وہ اسے بوسہ دے اور دعائیں دیتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

دونوں لڑکوں نے کھیلتے ہوئے سفر پورا کیا اور جلد ہی وہ قاہرہ کے ریلوے اسٹیشن پر اتر گئے۔ وہاں ان کا بھائی موجود تھا جس نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا اور ایک قلی کو بلا کر ان کا سامان جس میں زیادہ تر کھانے کی چیزیں اٹھوایا جونہی وہ سٹیشن کے دروازے باہر کے آئے انہوں نے ایک ریڑھا منگوایا اور لڑکے کے دوست کو سامان کے ساتھ اس پر سوار کرا دیا پھر ایک گاڑی رکوائی اور لڑکے کو احتیاط سے اس میں بٹھا کر سوار کروایا پھر اس کی دائیں طرف بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو اپنے گھر کا پتہ بتایا۔

۱۷

واپس آ کر اظہر ''منقلہ'' اور دوسری مسجدوں میں لڑکے نے درس لینے شروع کئے اور گرامر منطق اور فقہہ میں بہت محنت کی وہ متعلقہ میں مہارت حاصل کر رہا تھا جو کہ اظہر کا اعتراضات کا علم تھا اور جسے بہترین قدامت پسند طلبہ بہت پسند کرتے تھے۔ انتہا پسند اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن اعتدال پسند مصلحین اسے نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ صبح کے وقت وہ کنز پر طائی کی شرح پڑھتا۔ دوپہر کو اظہر یہ اور شام کے وقت سید الجرجانی کی ایساغوجی (قول اقوال) پر شرح۔ پہلا درس اظہر میں ہوا۔ دوسرا محمد بے عبدالذیب کی مسجد میں اور تیسرا شیخ عدوی کی مسجد میں جو شیخ کی اولاد میں سے ہی ایک استاد تھا۔ اکثر وہ دن چڑھے تک بہت تھک جاتا جب ان ہشام کی قطر الندی کا درس ہوتا۔ جو وہ گرامر پر عبور حاصل کرنے کے لئے بڑے شوق سے پڑھتا کہ جلدی سے ابتدائی کتابوں کو ختم کر لے اور الفیہ پر ابن عقیل کی شرح کا مطالعہ شروع کرے لیکن وہ اس درس میں باقاعدگی سے نہیں جاتا تھا۔ وہ شیخ کی ذہانت سے متاثر نہیں تھا اور اس کام کی تمام چیزیں شیخ عبدالمجید الشاذلی کی متعلقہ میں اظہر یہ پر اور عطار کی شرح میں مل جاتیں۔ اظہر یہ پر یہ درس اس کی یادداشت پر نقش ہو گئے تھے کیونکہ اس کے بعد ہی متعلقہ پر اس عبور حاصل ہوا۔ خصوصاً مصنف کے اس فقرے پر۔ ''حرف قد'' سے فعل کی ابتدا ہوتی ہے۔ لڑکے نے ان تمام اعتراضات اور جوابات کا گہرا مطالعہ کیا تھا جو اس فقرے کے حوالہ سے پیدا ہوئے تھے۔ اس نے اپنے سوالات اور اعتراضات سے شیخ کا ناک میں دم کر دیا یہاں

تک کہ اچانک بحث کے درمیان سکتہ ہو گیا اور ایک عجیب سے شیریں لہجہ میں جسے یاد کر کے ہمارا دوست کبھی ہنسے بغیر نہ رہ سکتا لیکن جس میں ہمدردی کا جذبہ بھی شامل تھا۔ شیخ نے کہا ''خدا ہمارے درمیان روز حساب انصاف کرے گا۔''

یہ بات اس نے بڑی بیزاری سے اور غصہ میں کہی لیکن اس میں ایک مخلصانہ ہمدردی کا جذبہ بھی شامل تھا۔ اسکا ایک اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ جب درس ختم ہو گیا اور لڑکا اس کے ہاتھ کا بوسہ لینے کے لئے بڑھا (مصافحہ کرنے کے لئے بڑھا) جو کہ طلباء کا عام دستور ہے۔ تو اس نے اپنا دوسرا ہاتھ لڑکے کے شانہ پر رکھتے ہوئے بڑے دھیمے اور مشفقانہ لہجے میں کہا۔ ''محنت کرو۔ خدا برکت دے گا''

اس ہمت افزائی سے لڑکے کو بہت طمانیت محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے بھائی کو یہ بات بتائی۔ جو چائے کے وقت کا منتظر رہا اور پھر جب سب جمع ہو گئے تو لڑکے کو چھیڑتے ہوئے اس نے کہا کہ ہمیں ''حرف قد سے فعل کی ابتدا ہوئی ہے'' والا قصہ سناؤ۔ پہلے تو لڑکا شرما کر خاموش ہو گیا لیکن جب دوسروں نے اصرار کیا تو اس نے جو کچھ سنا اور سیکھا تھا دہرانا شروع کر دیا اور اس پر اپنے خیالات بھی بیان کئے۔

وہ سب بڑے غور سے سنتے رہے اور جب وہ بول چکا تو معمر طالب علم جو ابھی سند حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اٹھا اور اس کی پیشانی کو چوما اور کہا ''خدائے حی و قیوم۔ جو کبھی سوتا نہیں۔ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے اور ہمت عطا کرے''

اس پر دوسروں نے قہقہہ لگایا۔ البتہ لڑکا بہت خوش تھا اور اس وقت وہ خود کو ایک جید عالم سمجھنے لگا تھا۔ اسے اپنے اس خیال کی تائید اس بات سے ملی کہ گرامر کے درس میں اس کے ساتھ اس پر خصوصاً توجہ کرتا اور درس کے بعد یا اس سے پہلے وہ اس سے سوالات پوچھتے اور مشورے لیتے تا کہ وہ دوپہر سے پہلے اپنے درس تیار کر سکیں۔ اس سے لڑکے کا دل بڑھتا۔ چنانچہ اس نے قطر الہند کا درس چھوڑ دیا اور ان لڑکوں کے ساتھ مل کر پڑھنے لگا جو اس کے سامنے ایک عبارت پڑھتے اور اسی کی تشریح کرنے کی کوشش کرتے لیکن جلد ہی وہ ان سے آگے نکل جاتا اور خود ہی شرح کرنی شروع کر دیتا۔

وہ اس کی تشریحات پر اعتراض نہیں کرتے تھے اور اس کے علاوہ کسی اور کو سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سے وہ اور زیادہ مغرور ہو گیا اور اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ

MashalBooks.org

جلد شیخ بن جائے گا۔

اس برس بھی اس کی زندگی پہلے کی طرح ہی رہی۔ اس میں کوئی خاص فرق نہیں آیا سوائے اس کے کہ اب وہ جتنی محنت کرتا تھا اتنی ہی اسکے علم میں ترقی ہوتی تھی جبکہ اپنے ہم عصروں کے مقابلہ میں اس کے احساس برتری کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس عمارت میں مقیم سینئر طلباء کے سامنے اس کی عاجزی بھی بڑھتی گئی۔ اپنے ساتھیوں اور اپنے بھائی کے دوستوں سے اس نے جو کچھ سنا اس سے اظہر کے شیخ صاحب اور طلباء کے متعلق اس کی معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔

اساتذہ اور طلباء کے متعلق اس نے ایک بات بھی ایسی نہیں سنی تھی جس سے وہ متاثر ہوتا اور وہ ان کے متعلق جس قدر زیادہ جاننا چاہتا اتنا ہی ان کے متعلق اس کی رائے کمزور ہوتی جاتی۔ یہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی کوئی ایک آدھ لفظ کسی شیخ کی ذہانت کی تعریف میں بھی کہہ دیتا۔ ان میں چھوٹے بڑے سب شیخ شامل تھے لیکن جو ان پر ملامتیں پڑتیں۔ چھوٹوں پر بھی اور بڑوں پر بھی۔ ان کا کوئی شمار نہیں تھا اور ان کی یہ کمزوریاں ہر قسم کی تھیں کردار کی بھی۔ اخلاقی بھی۔ بلکہ اہلیت کی بھی۔ ان سب کی وجہ سے لڑکے کے دل میں غصہ۔ حقارت اور مایوسی کا ایک طوفان اٹھ جاتا تھا۔

کوئی ایک شیخ بھی ان عیوب سے پاک نہیں تھا۔ مثلاً ایک اپنے رفقاء کار سے جلتا تھا اور ان کے خلاف سازشیں کرتا رہتا تھا۔ ان کے سامنے وہ مسکراتا رہتا مگر جونہی وہ پیٹھ موڑتے ان کے خلاف گھناؤنی باتیں کرتا اور ان کے خلاف ذلیل حربے استعمال کرتا۔ فریب ایک اور شیخ کا ایمان تھا۔ جب وہ اظہر میں یا اپنے رفقاء کے ساتھ ہوتا تو بڑا پاکباز بنتا لیکن جب تنہا ہوتا یا بد ساتھیوں میں ہوتا تو برائی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا۔

کبھی کبھی عیب جو اس کے ان بدکار ساتھیوں کے نام بھی بتا دیتے۔ بڑی عمر کے طالب علم بھی کبھی اس شیخ اور کبھی اس شیخ کے متعلق باتیں بناتے کہ وہ فلاں فلاں نوجوان میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لیتا ہے اس کی طرف تکتا رہتا ہے اور جب کلاس میں اس کا منظور نظر سامنے ہو تو بے چین ہوتا ہے۔

ان پر جو سب ذلیل الزام لگایا جاتا تھا وہ غیب کرتا اور دوسروں کو بدنام کرنا تھا۔ طالب علم اکثر بتاتے تھے کہ کیسے فلاں فلاں شیخ نے ریکٹر یا مفتی کے سامنے اپنے

بہترین دوست کی برائی کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ریکٹر تو ان مخبروں کی باتیں سنتا ہے لیکن مفتی ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتا اور انہیں لعنت ملامت کر کے بھگا دیتا ہے۔

ایک مرتبہ بڑے طالب علموں نے مقتدر شیخوں کے ٹولے کے متعلق جن کے انہوں نے نام بھی بتائے یہ کہانی سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ شیخ محسوس کرتے تھے کہ ان کی فحش کلامی بہت بڑھ گئی ہے اور اس پر وہ بہت شرمسار ہوئے۔ انہیں قرآن کے یہ الفاظ یاد آئے۔ ''ایک دوسرے کی برائی نہ کرو۔ تم میں سے کون چاہے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ کیا تمہیں اس سے کراہت نہیں آئے گی۔'' چنانچہ انہوں نے اس مکروہ گناہ سے اجتناب کرنے کا عہد کیا اور طے کیا کہ جو پہلے غلطی کرے گا وہ دوسروں کو بیس پیاستر ادا کرے گا۔

دو ایک روز تو وہ جرمانے کے ڈر سے دوسروں پر گند اچھالنے سے باز رہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جب ایک روز وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے تو ایک شیخ آ پہنچا۔ اس نے وہاں دن گزارا اور اپنی راہ چل دیا۔ ابھی وہ نظروں سے اوجھل ہوا ہی تھا کہ ان میں سے ایک نے اپنی جیب سے ایک چاندی کا سکہ نکالا۔ اسے اپنے ساتھیوں کو دیا اور اس شخص کی تابڑتوڑ برائیاں کرنے لگا۔

چھوٹے بڑے سب ہی طالب علم اپنے اساتذہ کی حماقتوں اور عبارت پڑھنے اور مفہوم سمجھنے میں ان کی مضحکہ خیز غلطیوں پر ہنستے رہتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شیخ صاحبان اور طلباء کے متعلق ہمارے دوست کی عمومی رائے بہت ہی خراب ہوگئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے کام پر توجہ دے اور جتنا ہو سکے علم حاصل کرے چاہے یہ کہیں سے بھی ملے۔

اظہر میں قیام کے تیسرے سال اس کا حقارت کا یہ جذبہ اس وقت مزید بڑھ گیا جب اس نے کنز پر ملا مسکیں کی شرح پڑھنے کے لئے فقہہ کے کسی استاد کی تلاش کی۔ اسے ایک مشہور استاد کا حوالہ دیا گیا جس کی بڑی شہرت تھی اور عدالتوں میں بڑا مقام تھا۔ چنانچہ وہ اس کے درس میں شامل ہو گیا لیکن ابھی پانچ ہی منٹ ہوئے تھے کہ اسے اس وقت سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا جب وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ وجہ یہ تھی کہ شیخ (خدا اس کی روح کو قرار دے) کی ایک عجیب طرح غیر معمولی عادت تھی۔ وہ کتاب کا کوئی فقرہ یا اس پر

MashalBooks.org

اس کی اپنی تشریح کو دہرائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ''وہ کہتا ہے۔ ہاں۔ وہ کیا کہتا ہے؟'' ہر چند منٹ کے بعد کئی مرتبہ ایسا ہوتا۔ یہاں تک کہ ہمارے دوست کو اپنی ہنسی ضبط کرنے میں سخت مشکل پیش آئی۔ اس وجہ سے وہ سارے ہی معاملہ سے بددل ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو تو پا لیا لیکن تین دفعہ سے زیادہ وہ درس میں نہ بیٹھ سکا۔ اس لئے کہ کچھ حاصل کرنے کی بجائے وہ اس سے بہت بیزار ہوا۔ اس نے بڑی دقت سے اپنی ہنسی کو روکا اور یہ کوشش اس کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ چنانچہ اس نے اس کتاب کے لئے کسی اور مدرس کی تلاش شروع کی لیکن اسے ایک بھی مدرس ایسا نہ ملا جس میں کوئی نہ کوئی مضحکہ خیز عادت نہ ہو جس سے اسے اتنی ہنسی آتی تھی کہ اسے قابو میں کرنے کے لئے اسے بہت زور لگانا پڑتا کہ اس میں کچھ سیکھنے کا یارا نہ رہتا۔ اس وقت اسے بتایا گیا کہ فقہہ کی کتابوں میں یہ کتاب کوئی ایسی خاص اہم نہیں تھی۔ اسے بتایا گیا اور ایک اعلیٰ استاد کے طور پر اس کی سفارش کی اور اسے ایک اچھا منصف قرار دیا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ اس کا درس ہی سننے کے قابل ہے۔

اس نے اپنے بھائی سے مشورہ کیا اور اس کے دوستوں کی رائے لی۔ انہوں نے منع کرنے کی بجائے اس کی ہمت افزائی کی۔ پہلے درس میں اسے بہت لطف آیا۔ اس لئے کہ اسے کسی فقرہ کو دہرانے کی کوئی خاص حرکت کرنے یا کسی طرح کی مخصوص آواز نکالنے کی کوئی بیماری نہیں تھی۔ اس کے پڑھانے یا تشریح کرنے میں فقروں کو بار بار دہرانے کی عادت نہیں تھی۔ اس کی ذہانت اور قانونی سمجھ بوجھ میں کوئی شک نہیں تھا اور نہ مضمون پر اس کی مہارت پر کوئی شبہ تھا۔

وہ ایک لمبا، دبلا پتلا شخص تھا جس کی آواز ناگوار نہیں تھی۔ اس کا انداز پروقار اور اس سے ملنے اور بات کرنے میں لطف آتا تھا۔ اس کو جدید رجحانات کا حامی سمجھا جاتا تھا۔ خیالات و افکار میں اتنا نہیں جتنا اس کے طور طریقہ میں۔ بڑے درجوں کے طالب علم کہتے تھے کہ صبح کے درس کے بعد وہ عدالت میں چلا جاتا ہے۔ وہاں مقدموں کے فیصلے کرتا ہے اور کھانا کھانے اور سونے کے لئے گھر چلا جاتا ہے۔ پھر شام کے وقت وہ اپنے بہت ہی قریبی دوستوں کے ساتھ ایسی جگہوں پر جاتا ہے جہاں اس جیسے عالم کو نہیں جانا چاہئے۔ وہاں وہ بے ہنگم گانے سنتا اور ایسی عیاشیوں کے مزے لیتا جن کا ایک شیخ سے کوئی واسطہ

نہیں ہونا چاہئے۔

یہاں وہ ''الف لیلہ'' کا ذکر کرتے۔ اس سے لڑکا حیران ہوتا۔ اسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ ''الف لیلہ'' ایک بڑے مزے کی کتاب ہے لیکن ان کے الفاظ سے کچھ اور ہی مطلب نکلتا تھا عیاشی کا کاروبار۔ ناچ گانے کی جگہ۔

لڑکے نے جب پہلی مرتبہ اپنے استاد کے متعلق یہ خرافات سنی تو اسے یقین نہیں آیا لیکن ابھی شیخ کے ساتھ اسے دو ہی ہفتے گزرے ہوں گے کہ اسے احساس ہوا کہ وہ درس کی تیاری میں کچھ سست پڑتا جا رہا ہے۔ اس کی تشریحات سرسری سی ہونے لگیں اور لڑکوں کے سوالوں سے وہ پریشان ہونے لگا۔ حد یہ کہ جب لڑکے نے کسی بات کی جو وہ پڑھا رہا تھا، وضاحت چاہی تو اس کی بے عزتی کی گئی اصولاً یہ شیخ گالیوں پر نہیں اترتا تھا۔ اس میں اتنی عزت نفس تھی۔

جب لڑکے نے اپنے بھائی اور دوسرے لوگوں کو بتایا کہ شیخ کے متعلق اس کی رائے کیا ہے تو وہ بہت حیران ہوئے اور انہیں اس سے ہمدردی بھی ہوئی۔ ایک نے تو دبے دبے لفظوں میں یہ بھی کہا کہ علمیت کی کمی کا الف لیلہ سے کچھ تعلق ہے۔

لڑکے کو فقہ کی نسبت گرامر میں زیادہ کامیابی نصیب ہوئی۔ وہ قطر الندا کے درس میں جاتا رہا اور ''شذور'' کے جس کے مصنف شیخ عبداللہ دراز (مرحوم) کی آواز میں اتنا ہی جادو اور اتنی ہی مٹھاس تھی جتنا کہ انہیں اپنے مضمون پر عبور تھا اور اسکے مشکل نکات پر وہ بڑی ذہانت سے لڑکوں کی مشکلات کو حل کر دیتے تھے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے گرامر میں لڑکے کے ذوق کو بہت تقویت ملی۔

یہ خوش نصیبی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ تعلیمی سال کے شروع میں لڑکے نے ابن عقیل کی شرح پر شیخ عبداللہ دراز کے درس میں جانا شروع کر دیا۔ لیکن عین درمیان میں جب ہر چیز بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہی تھی۔ شیخ کے سکندریہ کے انسٹی ٹیوٹ میں تبادلہ کے احکام آ گئے۔

شیخ اور طلبہ دونوں نے کوشش کی کہ یہ حکم بدل جائے لیکن ریکٹر نے کسی کی نہ سنی۔ اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسے حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ ہمارے دوست کو کبھی وہ دن نہیں بھولے گا جب اشک آلود آنکھوں سے استاد نے اپنے شاگردوں کو الوداع کہا۔ وہ ایسے

ہی کھل کر رو رہے تھے جیسے ان کا استاد۔ وہ اسے مسجد کے دروازے تک چھوڑنے آئے۔

اس شیخ کی جگہ ایک اور نے لے لی۔ یہ نابینا تھا۔ وہ اپنی تیز ذہانت کے لئے مشہور تھا اور اس کے انداز تعلیم کی ایک امتیازی خصوصیت تھی اور ان خصوصیات کی تعریف کے بغیر کبھی اس کا ذکر نہ کیا جاتا۔

یہ شیخ آیا اور اس نے وہیں سے درس شروع کیا جہاں شیخ عبداللہ دراز نے چھوڑا تھا۔ شیخ عبداللہ کے ہاں اتنا ہوتا تھا کہ محمد بے عبدالذہب کی مسجد میں اس کا گوشہ پوری طرح بھر جاتا لیکن جب نابینا شیخ نے درس شروع کیا تو مجمع بڑھتا گیا یہاں تک کہ ساری جگہ بھر گئی۔ اس کے پہلے درس سے طلباء بہت خوش ہوئے گو انہیں اپنے پرانے استاد کا شیریں لہجہ اور اس کی خوش مزاجی بہت یاد آئی لیکن دوسرے اور تیسرے درس میں انہیں یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی کہ وہ بہت مغرور۔ خود پسند اور ضرورت سے زیادہ خود اعتماد تھا۔ وہ اپنے خیالات میں بہت پختہ تھا اور مداخلت برداشت نہیں کرتا تھا۔

اس کے چوتھے درس کے شروع ہونے پر ایک واقعہ ہوا جس نے نوجوانوں کو گرامر سے ہمیشہ کیلئے بھگا دیا۔ شیخ نے تابط شرا کا ایک شعر پڑھا اور اس کی تشریح کی جو لڑکے کو بہت بے معنی لگی۔ ہمارے دوست کے اعتراض کا جواب اس نے گالی سے دیا اور جب اس نے اصرار کیا تو ایک لمحہ خاموشی کے بعد۔ ''دفع ہو جاؤ۔ میں ایک کتے کے بچے کی موجودگی میں درس جاری نہیں رکھ سکتا۔'' ان الفاظ کے ساتھ شیخ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ لڑکا بھی اٹھ گیا۔ اور دوسرے اس کی بری طرح پٹائی کرتے اگر بالائی مصر کے اس کے ساتھی اس کو حلقہ میں نہ لیتے اور ان کو جوتے دکھا کر بھگا نہ دیتے۔ وہ کون سا ظہری تھا جو اس زمانہ میں بالائی مصر کے جوتوں سے نہ بھاگا ہو!

یہ لڑکے کا گرامر پر آخری درس تھا لیکن نہیں۔ دوسرے روز وہ ایک درس میں گیا جو شرقیہ صوبہ کا ایک شیخ الاشمونی کی شرح پر دے رہا تھا لیکن وہ آخر تک اسے نہ سن سکا۔ شیخ کے کتاب پڑھنے و تشریح کرنے کے دوران نوجوان طالب علم نے اس سے کوئی سوال کیا۔ جواب سے مطمئن نہ ہونے پر اس نے اپنا سوال دہرایا۔ اس سے شیخ اس قدر برہم ہوا کہ اس کو حلقہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ جس پر اس کے کچھ دوستوں نے شیخ کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جس سے شیخ اور بھڑک اٹھا۔ اس نے اس وقت تک درس دینے سے

انکار کر دیا جب تک یہ بندر اور اسکے ساتھی نکل نہ جائیں اب جانے کے سوائے چارہ نہ تھا اس لئے کہ شرقیہ کا جوتا تیار تھا اور شرقیہ جوتے بالائی مصر کے جوتوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔

اگلے روز یہ نوجوان اور اسکے ساتھی ایک حلقہ میں داخل ہوئے جہاں شرقیہ سے آیا ہوا ایک ممتاز شیخ الاشمونی کی شرح پر درس دے رہا تھا۔ نوجوان اس حلقہ میں پانچ منٹ سے زیادہ نہ ٹھہرا۔ شیخ کے گھسے پٹے اس جملہ کو جو وہ ہر فقرے کے بعد دہراتا اس سے زیادہ دیر برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ''سب جہنم میں جائیں۔'' نوجوان اور اس کا دوست قہقہے لگانے لگے اور درس سے چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے اور اسکے دوستوں نے طے کیا کہ وہ گرامر خود اصل کتابوں سے پڑھیں گے۔ چنانچہ انہوں نے زمشخری کی مفصل اکٹھے بیٹھ کر پڑھی اور اس کے بعد سیبویہ کی کتاب۔ لیکن ایک علیحدہ قصہ ہے۔

فقہہ اور گرامر کی طرح منطق میں بھی قسمت نے اس کی کوئی یاوری نہیں کی شیخ عدوی کے نوجوان رشتہ دار سے اساغوجی پر جرجانی کی شرح پڑھتے ہوئے وہ گزشتہ برس منطق سیکھنے کا بہت خواہاں تھا۔ اس برس اظہر میں ایک شخص آیا جوان جیسے عام طلباء کے لئے واقعی اظہر کے آسمان پر ایک ستارہ تھا۔ وہ منطق اور فلسفے کے اماموں کے درمیان ایک امام تھا۔ اعلیٰ درجوں کے طلباء میں اس کی شہرت ایک ایسے عالم کی تھی جس کی ذہانت آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی مگر اس میں کوئی روشنی نہیں تھی اور جس کی فصاحت کانوں میں رس گھولتی تھی مگر ذہن کو متاثر نہیں کرتی تھی۔ اگر یہ افواہ صحیح ہے تو وہ اپنے متعلق یہ کہا کرتا تھا۔ ''خدا نے جو اہلیتیں مجھے عطا کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں گھنٹوں مسلسل بول سکتا ہوں اور یوں کہ کوئی ایک لفظ بھی نہ سمجھے۔ بلکہ میں خود بھی کچھ نہیں سمجھتا۔'' وہ اسے بڑے فخر کی بات سمجھتا تھا لیکن وہ طالب علم جنہیں اپنے متعلق کچھ زعم تھا اس کے درس میں جانے پر مجبور تھے جو مغرب کے بعد ہوتا تھا وہ ''تہذیب المنطق'' پر خبیصی کی شرح پڑھا رہا تھا۔ ہمارا دوست دو ایک مرتبہ درس میں شریک ہوا۔ وہاں اتنا مجمع ہوتا تھا کہ محمد بے کی مسجد کے گنبد سے بھی آگے نکل جاتا تھا۔ وہ جلدی جلدی مغرب کی نماز فارغ ہوتا تا کہ شیخ سے قریب جگہ حاصل کر سکے۔ نوجوان شیخ کی آواز بلند تھی اور اس کا لہجہ ابھی تک خالص بالائی مصر کا تھا۔ وہ بہت زندہ دل تھا اور اسکے انداز میں شگفتگی تھی۔ اگر کوئی طالب علم اسے ٹوکتا

MashalBooks.org

تو وہ اس کو سختی سے ڈانٹ دیتا۔ اگر کوئی اپنے سوال پر اصرار کرتا تو وہ غصہ میں چلاتا ''خاموش۔ بدمعاش۔ پلروے'' اور گالیاں دیتے ہوئے وہ کچکچا کر منہ سے لفظ نکالتا۔

بہرحال مدرس اور طلباء کے درمیان ''تصورات'' کے درس تک حالات ٹھیک رہے۔ جب دوسرے باب میں ''تصدیقات'' تک پہنچے تو اس نوجوان اور اس کے استاد کے درمیان ایک زبردست جھگڑا ہوا جس کے اگلے روز وہ درس میں بہت پرے کو ہو کر بیٹھا۔ اس واسطے وہ روزانہ زیادہ سے زیادہ دیر کر کے آنے لگا آخر ایک روز وہ گنبد کے دروازے پر پہنچ گیا۔ پھر ایک شام وہ ایسا گیا کہ اس کے بعد لوٹ کر نہیں آیا۔

جب اسے اپنے اور شیخ کے درمیان یہ جھگڑا یاد آتا تو وہ ہنسے بغیر نہ رہ سکتا۔ اور وہ خود اور اس کا بھائی ہنستے ہنستے پاگل ہو جاتے۔ شیخ اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا اور ان الفاظ سے شروع کرتا ''تصدیقات کا دوسرا باب'' وہ بڑی زور زور سے پڑھتا۔ پھر وہ انہی الفاظ کو دہراتا لیکن الفاظ کو ذرا کھینچ کھینچ کر ادا کرتا۔ پھر تیسری بار اس نے آواز کو دہرایا لیکن تصدیقات کی جگہ اس نے کہا۔ ''دوسرا باب............کس کا؟'' کسی نے جواب نہ دیا تو وہ خود بولا ''تصدیقات'' کا پھر اس نے اسی بے ترتیبی سے الفاظ دہرائے اور پھر جب وہ اسی لفظ پر آیا ''کون'' اور کسی نے جواب نہ دیا تو اس نے لڑکے کے سر پر ہاتھ مارا اور چلایا۔ ''اب بول۔ پیڈو۔ بدمعاش۔ سور کے بچے۔'' اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور سب لڑکوں نے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

''تصدیقات''

لڑکا سارے معاملہ سے تنگ آ گیا اس لئے کہ یہ بہت مضحکہ خیز تھا۔ پھر بھی وہ استاد کے سامنے ہنستے ہوئے ڈرتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ استاد کی مار پر بھی جھلاتا تھا۔ بہرحال جلد ہی اس نے اس درس میں جانا چھوڑ دیا اور ''قضایا'' کا باب ترک کر دیا۔

چونکہ اس نے سال کے درمیان میں اس درس کو چھوڑا تھا اس لئے اس نے نئے شیخ سے جو ابھی سند لے کر آیا تھا۔ دینیات پر درس لینے شروع کئے۔ اعلیٰ درجوں کے طلباء میں اس کے دوست اس شخص کو ذہین سے زیادہ خوش مزاج سمجھتے تھے اس کی آواز اچھی تھی اور انداز بیان شاندار تھا لیکن اس کی علمیت محض ایک فریب تھی۔ گفتگو میں پہلی ملاقات میں وہ خاصا معتبر لگتا تھا لیکن ذرا قریب سے دیکھنے اس کا کھوکھلا پن صاف نظر آ جاتا تھا۔ وہ در

دیر کی ''خریدہ'' پر شرح پڑھ رہا تھا۔ لڑکے نے ایک درس میں شرکت کی۔ اس کی خوبصورت آواز کو سراہا اور اسکے شاندار لہجے کی تعریف کی اور اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی علمیت اور متقالہ سے بھی متاثر ہو جائے گا لیکن بدقسمتی سے شیخ کے درس ختم ہو گئے۔ اسے قاہرہ سے دور ایک قصباتی شہر میں تبدیل کر دیا گیا تھا جہاں اس کو بطور قاضی تعینات کیا گیا تھا۔ چنانچہ لڑکے کو اس کی علمیت کے پرکھنے کا موقع نہیں ملا۔ نہ وہ اس کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کر سکا سوائے اس کے کہ وہ بہت قابل اور دلکش تھا۔ اسکی آواز بڑی پرکشش تھی اور اس سے بات کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔

حقیقت میں ان تمام کم نصیبوں کے باوجود لڑکے نے پورے سال میں عملی طور پر کچھ بھی حاصل نہیں کیا سوائے اس کے کہ وہ خود مطالعہ کرتا رہا یا وہاں رہنے والے اعلیٰ درجوں کے طلباء کی باتیں سنتا رہا جو اپنی کتابوں کے متعلق گفتگو کرتے تھے یا ان پر بحث کرتے تھے۔

جب وہ اظہر واپس آیا تو اگلے سال اسے پھر سخت مایوسی ہوئی اور اس کے ضمیر نے اسے سخت کچوکے دیئے۔ وہ اپنی زندگی کو کس رخ ڈھالے۔ وہ دیہات میں رہ نہیں سکتا تھا اس لئے کہ وہاں اس کے لئے کرنے کو کچھ نہیں تھا اور قاہرہ میں ٹھہرنے کا اور ایسے درس لینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اس موقع پر وہ ادب کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس کی ادبی تعلیمات پر گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ جیسا کہ شبیبہ جمیل کے لئے اپنی بیقراری کو قرار دینے کے لئے کہتی ہے۔

''ابھی محبت کی ساعت اپنے کمال کو نہیں پہنچی ہے۔''

۱۸

دراصل ادب پر درس میں حاضریوں سے لڑکے کی توجہ اظہر کے علوم سے ایک دمن ہیں ہٹ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا ذہن دونوں شعبوں میں ایک ساتھ کام کرسکتا ہے۔ اسے قاہرہ اس لئے نہیں بھیجا گیا تھا اور نہ ہی اظہر میں اس لئے داخل کرایا گیا تھا کہ وہ شاعر یا نثر نگار بنے بلکہ اسے اظہر کا تمام نصاب مکمل کرنا تھا اور سند لینی تھی اور پھر اس مقدس مسجد کے ستون سے کمر لگا کر وہ طلبہ کے حلقہ میں فقہہ یا گرائمر یا دونوں پر درس دے گا۔

اس کے باپ نے اس کے لئے ایسے ہی خواب دیکھے تھے جیسا کہ اس نے سب گھر والوں کو امید اور فخر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنے اس بے ڈھب سے سر پھرے لڑکے کے متعلق بتایا تھا۔ یہ اسکے بھائی کی خواہش بھی تھی اور اس کی اپنی بھی۔ اسکے علاوہ اور کیا خواہش کرسکتا تھا۔ اس جیسے نابینا لوگوں کے لئے جو ایک معقول زندگی گزارنا چاہتے ہیں صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا اظہر میں تعلیم حاصل کریں اور سند لیں اور یوں ان کی روزی پکی ہو جائے جو تیسرے درجہ میں پاس ہونے کی صورت میں روزانہ روٹیوں کا مقررہ الاؤنس اور ماہوار پنشن کو 75 پیاستر سے زیادہ نہیں تھی۔ دوسرے میں پاس ہونے کی صورت میں 100 پیاستر تھی اور اول درجہ میں پاس ہونے کی صورت میں 150 پیاستر تھی یا پھر قرآن خوانی کو پیشہ بنالیں جیسا کہ ایک دفعہ اس کے باپ نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ اسے موت پر یا خاندانی تقریبات میں قرآن خوانی پر لگادے گا۔

نوجوان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اظہر میں اپنی تعلیم مکمل کرے۔ جب ایک طالب علم تین چار برس اظہر میں گزار لیتا تو اس کی زندگی دو شاخوں میں بٹنی شروع ہو جاتی۔ ایک مہکتی جس میں لیکچرز میں حاضری دینا اور امتحانوں میں پاس ہونا شامل تھا۔ نوجوان اسی راستہ پر چل رہا تھا جو اس نے بڑے جذبہ سے شروع کیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ اشتیاق کم ہونے لگا اور آخر کار شیخ صاحبان اور ان کی تدریس سے بددل ہو کر وہ حقارت کے ساتھ اس سے برگشتہ ہو گیا۔

دوسرے شعبہ کا مالی منفعت سے تعلق تھا اور اسکے تین مرحلے تھے۔ پہلے (میٹریکولیشن) منتسب پھر منتظر اور آخر میں مستحق یا Candidature۔ رجسٹروں میں اندراج کے بعد پہلا مرحلہ آتا ہے جسے منتسب (Matriculation) کہا جاتا۔ اس کا مطلب تھا کہ ایک شعبہ میں داخلہ مل گیا ہے اور ہمارے دوست کو اپنے بھائی کی طرح رواق قشینہ میں داخلہ مل گیا تھا۔ دوسرا مرحلہ منتظر کا تھا جس میں اظہر کچھ عرصہ گزارنے کے بعد طالب علم کو داخلہ ملتا۔ اس کے لئے اسے اپنے شعبہ کے سربراہ سے ایک رقعہ لانا پڑتا جس میں درج ہوتا کہ اظہر میں اس نے کتنے سال گزارے ہیں اور کون کون سے درس میں حاضری دی ہے دو شیخوں سے ان بیانات کی تصدیق کرائی جاتی۔ اسے شعبہ کے سربراہ سے درخواست کرنی پڑتی کہ وہ اس کا نام منتظرین کی فہرست میں لکھ لے تاکہ جب بھی کوئی مستحق جگہ خالی کرتا تو اسے اس کی جگہ لے لیا جاتا اور یوں وہ اس شعبہ کے حصہ کے مطابق دو تین یا چار روٹیوں کے راشن کا حقدار ہو جاتا۔

چنانچہ ہمارے دوست کی بحیثیت منتظر تقرری ضروری تھی۔ چنانچہ اس نے مطلوبہ درخواست لکھی اور اسے اسی رسمی جملہ پر ختم کیا ''خدا نے آپ کو امیدواروں کی پناہ بنایا ہے'' دو شیخ صاحبان نے تصدیق کی کہ درخواست میں جو کچھ بیان کیا گیا تھا درست تھا۔ پھر وہ اس درخواست کو شیخ کے پاس اس کے گھر لے گیا اور اسکے ہاتھ کو بوسہ دے کر اور درخواست اس کو پیش کر کے لوٹ آیا۔ چنانچہ اسے منتظرین کی مد میں رکھ لیا گیا اور یہ عرصہ کافی طویل تھا۔ بلکہ درحقیقت اسی شعبہ میں وہ ظیفہ کا استحقاق کبھی حاصل نہ کر سکا۔ تاہم اس کی اس تقرری سے اس کے باپ کو بہت اطمینان ہوا اور وہ بڑا فخر محسوس کرنے لگا۔

MashalBooks.org

جب وہ اس منتظری حیثیت میں خاصے اطمینان بخش طریقہ سے تحصیل علم میں مصروف تھا امام اظہر سے ریٹائر ہو گیا۔ جس کی وجہ وہ مشہور واقعہ تھا جب خدیو نے مصر شیوخ علماء کے سامنے تقریر کی۔

اس نوجوان کا یہ خیال تھا کہ امام کے شاگرد جو ہر شام بڑی تعداد میں عباس کے چھتے ''رواق عباس'' میں جمع ہوتے تھے تحریک شروع کر دیں گے اور خدیو پر ثابت کر دیں گے کہ اظہر کے نوجوانوں کو سخت دھچکا لگا ہے اور وہ صرف اپنا وقت ہی نہیں بلکہ اپنا دل بھی امام پر نچھاور کرتے ہیں۔

لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ امام نے اظہر کو چھوڑ دیا اور ایک گھر لے کر مفتی کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کے شاگردوں نے چوری چھپے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن اپنے خیالات اپنے تک ہی رکھے۔ چند ایک اس کے گھر عین شمس بھی گئے لیکن اکثریت نے اس سے کنارہ کشی کی۔ اور یوں وہ تمام قصہ ختم ہو گیا۔ جہاں تک اس نوجوان کا تعلق ہے اس کا دل شرم اور غصہ سے بھرا ہوا تھا اور شیخ صاحبان کو وہ بہت حقارت سے دیکھنے لگا تھا اور طالب علموں کو بھی حالانکہ نہ وہ امام کو جانتا تھا نہ اس کی کبھی اس سے ملاقات ہوتی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد امام کا انتقال ہو گیا اور پورے مصر پر اس کی موت کا گہرا اثر ہوا۔ البتہ اظہر کے حلقے دوسروں کی نسبت اس المیہ سے بہت کم متاثر ہوئے۔ امام کے شاگردوں کو بہت افسوس ہوا اور چند ایک نے کچھ آنسو بھی بہائے۔ لیکن گرمی کی چھٹیوں کے بعد جب وہ واپس آئے تو یوں لگا جیسے امام کا انتقال ہوا ہی نہ ہو۔ یا شاید وہ کبھی تھا ہی نہیں سوائے اس کے کہ اس کے چند معتقد طلباء کبھی کبھی افسوس کے ساتھ اس کا ذکر کر لیا کرتے تھے۔

چنانچہ اس چھوٹی سی ہی عمر میں اس نوجوان کو یہ تلخ تجربہ ہوا کہ عظیم لوگوں کے لئے سب عزت واحترام اور تمام توجہ اور تہنیت محض بے کار لفاظی ہے اور عقیدت کا اظہار اکثر زبانی جمع خرچ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اس بات نے نوجوان کو انسانوں کی طرف سے اور بھی بددل کر دیا کہ کچھ حلقوں نے امام کی موت کا فائدہ اٹھا کر اس کے نام اور اس سے اپنی قربت کا ڈھونگ رچا کر اس

کے متعلق مضامین اور نظمیں لکھ کر پیسہ کمانا شروع کر دیا اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اخباروں اور رسالوں میں اس کے متعلق بیانات دے کر کافی رقم بنائی۔

لڑکے نے اور بھی کچھ دیکھا جس سے وہ اظہر سے بیزار ہو گیا اور شیخ صاحبان اور طالب علموں کے لئے اس میں حقارت کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس نے دیکھا کہ وہ جو واقعی امام کی موت پر سوگوار تھے انہوں نے عمامے اتار دیئے اور طربوش پہن لئے وہ اندر ہی اندر ان کی طرف کھنچنے لگا اور اس کی خواہش ہوئی کہ ان کی صحبت حاصل کرے لیکن ایک نابینا لڑکے کے لئے یہ کس طرح ممکن تھا جو کہ اظہر اور اس کے حلقوں میں رہنے پر مجبور تھا۔

امام حنفیہ شعبہ کا صدر تھا۔ اور جب وہ اظہر سے گیا بلکہ جب اس کا انتقال ہو گیا۔ تو اس کا جانشین مفتی شعبہ کا صدر بھی ہو گیا۔

نئے مفتی کا بیٹا ہمارے دوست کا ایک استاد تھا اور وہ چھوٹے درجوں میں سے ایسا غوبی پر استید جرجانی کے شرح پر درس دیتا تھا۔ وہ اپنے باپ حنفیہ شعبہ کے صدر، کا نائب بھی تھا۔ جس میں بطور ''منتظر'' داخلہ کے لئے ہمارے دوست پر بہت دباؤ ڈالا گیا۔ یہاں دوسرے شعبوں کی نسبت راشن وافر بھی تھا اور یہ صرف امتحان کے ذریعہ ہی ممکن تھا۔ نئے مفتی نے اسے طریقہ کو جاری رکھا اور اس کا بیٹا داخلہ کے لئے آنے والی درخواستوں کی پڑتال کرتا اور اس کے لئے سال میں وقت کا تعین بھی وہ خود ہی کرتا۔ لڑکے سے پوچھا گیا کہ وہ اس شعبہ میں داخلہ کیوں نہیں لینا چاہتا۔ امام کے زمانے سے اس کا بھائی اور اسکے ذہین ساتھی اس کے رکن رہے ہیں اور انہیں روزانہ چار روٹیاں ملا کرتی تھیں۔ چنانچہ اپنے اور دوسروں کے زبردست اصرار پر وہ ایک روز ضروری کاغذات لے کر ممتحن کے گھر گیا۔ اس کو اندر بلایا گیا جہاں شیخ نے اس کا استقبال کیا۔ اس سے درخواست لی اور اس کو دیکھا۔ پھر نوجوان سے ایک سوال کیا جس کا اس نے غالباً صحیح یا شاید غلط جواب دیا۔ جواب اسے یاد نہیں۔ بہرحال شیخ نے جواب دیا ''بالکل ٹھیک۔ اب تم جا سکتے ہو'' چنانچہ وہ بہت خوش خوش وہاں سے واپس آیا اور جلد ہی وہ ایک مکمل مستحق بن گیا اور اسے دو روٹیاں روزانہ ملنے لگیں۔ اس طرح اس کے پاس کافی روٹیاں ہو جاتیں اور گھر کے لوگ بہت ہی خوش تھے۔

صرف روٹیوں کا ہی فائدہ نہیں تھا۔ اسے شعبہ میں ایک الماری بھی دی گئی جسے وہ بہت اہم سمجھتا تھا اب جب وہ اظہر جاتا تو سیدھا اپنی الماری تک جاتا۔ اس میں اپنے جوتے رکھتا۔ ایک یا دو روٹیاں رکھتا اور پھر سارا دن بے فکر ہو کر گزارتا خصوصاً جوتے کے متعلق جو بہت مہنگے تھے اور جن کے چوری ہو جانے کا ڈر رہتا۔ اظہر میں جوتے بہت چوری ہوتے تھے اور احاطہ میں ہر طرف جوتوں کے چوری ہونے کے بے انتہا نوٹس چسپاں ہوتے جس میں درخواست کی جاتی کہ انہیں فلاں جگہ پہنچا دیا جائے یا فلاں شعبہ میں دے دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ انعام کی ترغیب اور سزا کی دھمکی بھی ہوتی کہ چور پکڑا گیا تو اسے اظہر سے نکلوا دیا جائے گا۔

چنانچہ نوجوان تعلیم اور درس سے زیادہ اس الماری اور دو روٹیوں سے بہت خوش تھا۔ تاہم اس نے ہمت کر کے صبح سویرے دینیات پر شیخ راضی (مرحوم) کے درس میں شرکت کی یہ درس ''مقاصد'' پر تھا۔ دن چڑھے وہ فقہ پر شیخ محیت کے درس میں گیا اور ''ہدایہ'' پڑھی دو پہر کو وہ شیخ عبدالحکیم علا کے شرح کے درس میں حاضر ہوا۔

فقہہ کا درس اگر کچھ اور نہیں تو بہت دلچسپ تھا ایک تو یہ کہ جب بھی طلباء موقع دیتے شیخ گانے سناتا۔ پھر وہ بڑا اجگت باز تھا۔ جو اظہر کی ایک خصوصیت تھی۔ جس سے وہ گانے میں مداخلت کرنے والے طلباء کی خوب خبر لیتا یا ان کی جواس کے پڑھنے یا اس کی کسی اور بات پر اعتراض کرتے اور جب کبھی وہ اچھے موڈ میں ہوتا یا اس کا بہت جی چاہتا تو اپنے شعر سناتا۔ نوجوان نے اس کا ایک شعر یاد کر لیا اور اسکے لہجے کی روانی کو کبھی نہ بھلا سکا۔

اس کے سر پر عامہ گھاس کی بالیوں کے جال کی طرح تھا
جو اونٹ کی پیٹھ پر سامان کے اوپر پھیلا ہوا ہے۔

جب لڑکے نے یہ شعر اپنے بھائی اور دوسروں کو سنایا تو وہ بہت ہنسے اور ایک دوسرے کو یہ سناتے اور دہراتے رہے۔ ایک شعر اور بھی تھا۔ کچھ کم مزاحیہ اور عجیب نہیں جو کسی عالم شیخ کی موت پر اس کے مرثیہ کا آغاز تھا۔

آہ۔ سب سے بڑا دکھ اے نبی! آپ کی وفات کے بعد
ہے ایسے نیک لوگوں کی موت جیسے کہ اس مراقشی کی

کچھ سال کے بعد شیخ کا ایک اور شعر ہر جگہ مصریوں کی زبان پر تھا اور خاص

خاص لوگ تو اب بھی اسے نہیں بھولے۔ یہ تقریباً ایک ضرب المثل بن گیا۔

ہم شاہزادوں۔ وزیروں اور امرائے وفد کے ساتھ ہیں

ہمارے دل ان کی حمایت میں مستحکم ہیں

نوجوان اکثر شیخ سے لمبی لمبی بحثیں کرتا۔ ایک مرتبہ تو اس نے حد کر دی اور درس کے ختم ہونے کے بعد بھی الجھا رہا یہاں تک کہ طلباء سیدنا الحسن کے پہلو سے نعرے لگانے لگے ''بہت ہو گیا۔ اب لوبیا نہیں بچے گا'' لیکن شیخ اپنے خوشگوار لہجے میں بولتا رہا ''بالکل نہیں۔ جب تک ہم اس خبطی کو قائل نہ کر لیں دم نہیں لیں گے'' چنانچہ خبطی کے لئے قائل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ خود بھی لوبیا لینا چاہتا تھا پیشتر اس کے کہ وہ سب دوڑ پڑیں۔

بلاغت پر درس اسے بہت اچھا لگا۔ لیکن اس کے لئے نہیں کہ اس سے اس کے علم میں کچھ اضافہ ہوا بلکہ اس لئے کہ اب اس بات کو ایک زمانہ ہو گیا تھا جب وہ اظہر میں اس واسطے کسی درس میں شریک ہوتا تھا کہ اس کے علم میں اضافہ ہو گیا۔ وہ تو صرف قوائد کی پابندی کی خاطر وہاں جاتا تھا یا وقت گزارنے اور دل بہلانے۔ یہ آخری مقصد بلاغت کے درس میں خوب پورا ہوتا تھا۔ اس لئے کہ شیخ۔ خدا اس کا بھلا کرے۔ بہت حاضر دماغ تھا اور طلباء کے لئے بڑی لگن اور ذمہ داری سے محنت کرتا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ وہ مضمون کو سمجھنے کے لئے سخت محنت کرتا اور پھر یہ علم ان کو منتقل کر دیتا۔ وقتاً فوقتاً جب وہ تھک جاتا تو ذرا سانس لیتا اور بڑے خوشگوار انداز میں اور بڑی لے سے پوچھتا کہ جناب کیا آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔ وقفہ کے دوران اسے خود اپنے آپ پر اور طالب علموں پر ترس آ جاتا اور چند منٹ کے لئے پڑھائی یا تشریح کو ترک کر دیتا۔ جس کے دوران ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلتا۔ اس کے بجائے وہ نسوار نکالتا اور بڑے تکلف سے ایک لمبا سانس لے کر اسے سونگھتا۔ طلباء اس وقفہ کا فائدہ اٹھا کر کیک اور لوبیئے سے اپنی پیاس بجھاتے۔ وہ ریڑھی والے سے شربت کے گلاس لاتے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہلکے ہلکے گلاس ٹکراتے۔

ایسے ہی وقفوں میں سے ایک وقفہ میں ایک بہت اہم واقعہ ہے۔ نوجوان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لیٹا ہوا سستا رہا تھا۔ جب کہ شیخ نسوار سونگھ رہا تھا اور لڑکے شربت پی

رہے تھے۔ اس وقت ایک قاصد نوجوان اوراس کے دوساتھیوں کے پاس آیا اور آہستہ سے انہیں بتایا کہ ریکٹر نے ان کو بلایا ہے۔

لیکن ابھی اس قصہ کے سنانے کا وقت نہیں آیا ہے۔ اور ویسے بھی یہ اب سب کو معلوم ہو گیا ہے۔ نوجوان اور اس کے دونوں دوست درس سے اٹھ کر چلے گئے اور پھر واپس نہیں آئے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب نوجوان ان معاملات میں الجھ گیا تھا جنہیں وہ انتہا تک لے گیا گواس طرح اظہر میں کامیابی حاصل کرنے کی تمام توقعات ختم ہو گئیں۔

اظہر کے ایک بااثر شیخ سے دربار ناراض ہو گیا اور اسے درس دینے سے منع کر دیا گیا۔ یہ صرف شیخ کے ساتھ بے انصافی ہی نہیں تھی بلکہ اسے اظہر کی بے عزتی پر محمول کیا گیا لیکن اس کی تلافی کے لئے کچھ نہیں کیا گیا اور خود اظہر والے ہی سب سے زیادہ بے حس اور ڈرپوک ثابت ہوئے۔ البتہ نوجوان کے ساتھیوں میں سے ایک۔ جس نے بعد میں بھی کئی موقعوں پر جرات کا اظہار کیا۔ اس کے پاس آیا اور کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ ہمارے شیخ کے ساتھ کتنی زیادتی کی گئی ہے۔'' نوجوان نے کہا ''بے شک۔ زیادتی سے کچھ زیادہ ہی'' ''کیا تم اس کے خلاف احتجاج میں شریک ہو گے؟'' ''یقیناً۔ لیکن اس کی صورت کیا ہو گی؟'' ''ہم اپنے کچھ دوستوں کو اکٹھا کریں گے جو شیخ سے ہمارے ساتھ درس لیتے تھے اور اس سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے گھر پر ہماری تدریس جاری رکھے۔ اگر وہ مان گیا تو نہ صرف ہمیں پڑھائی میں مدد ملے گی بلکہ اخبارات میں اس کا اعلان کر کے ہم اظہر کے آمروں کو یہ جتا سکیں گے کہ ہم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو ان کے جرائم سے بیزار ہیں اور ان کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں ہیں۔'' نوجوان بڑی خوشی سے اس کے لئے تیار ہو گیا۔

چنانچہ شیخ کے کچھ طالب علم اکٹھے ہوئے اور اسے اپنا منصوبہ بتانے گئے جس پر وہ متفق ہو گیا۔ پھر انہوں نے اخباروں میں اعلان کرایا کہ وہ انہیں مسلم العلوم فی المنطق اور مسلم الثبوت فی الاصول کی تعلیم دے گا اور دونوں کتابیں آدھے آدھے ہفتہ پڑھائے گا۔

چنانچہ شیخ نے گھر پر ہی درس دینے شروع کر دیئے اور جیسے جیسے طالب علموں کو

اس کی خبر ہوئی وہ جوق در جوق وہاں آنے لگے۔ نوجوان اپنی اس جرات پر بہت خوش ہوئے اور ہمارے دوست کو بھی امید کی ایک کرن نظر آئی۔

لیکن ایک روز شیخ کی کسی بات پر وہ اس سے الجھ پڑا۔ طویل بحث ہوئی اور آخر میں شیخ بے قابو ہو گیا اور اس نے بڑے طنز کے ساتھ کہا۔ ''لڑکے خاموش ہو جاؤ۔ ایک نابینا کو ان باتوں کا کیا علم ہو سکتا ہے''۔ اس سے لڑکے کو زبردست دھچکا لگا۔ لیکن شیخ بڑی بے رحمی سے کہتا رہا۔ کتنی ہی بک بک کرو۔ سچ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا نہ غلط کو صحیح کہا جا سکتا ہے۔'' اسکے بعد ایک بڑی تکلیف وہ خاموشی چھا گئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''دفع ہو جاؤ تم سب۔ آج اتنا ہی کافی ہے۔''

اس دن کے بعد لڑکا پھر اس درس میں نہیں گیا اور اسے شیخ کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں رہی۔

یوں اظہر سے اس کی بیزاری پھر لوٹ آئی۔ اب اس کی ساری امیدیں ادب کی تعلیم سے وابستہ ہو گئیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس تعلیم پر بات کریں اور ان اثرات پر جو اس نے اس نوجوان پر مستقلاً قائم کئے۔

MashalBooks.org

۱۹

قاہرہ میں اس کی آمد کے بعد سے ادب اور دانشور اسی قدر کثرت سے موضوع بحث بنے رہتے جس کثرت سے دینیات اور عالم شیخ صاحبان۔ اعلیٰ درجوں کے طلباء ادب پر گفتگو کے دوران ایک شیخ شنقیطی (مرحوم) کا نام لیا کرتے تھے جو امام کا دوست اور منظور نظر سمجھا جاتا تھا۔ اس غیر مانوس سے نام نے لڑکے پر عجیب تاثر پیدا کیا۔ اس سے بھی زیادہ عجیب وہ قصے تھے اور وہ نامعقول حرکتیں اور باغیانہ خیالات جن کی وجہ سے یہ شیخ کچھ لوگوں کے مذاق کا نشانہ اور کچھ کے لئے ہوا بن گیا تھا۔ اعلیٰ درجوں کے طلباء کہا کرتے تھے کہ انہوں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو حافظہ میں اور مکمل متن اور اسناد کے ساتھ حدیثیں بیان کرنے میں شیخ الشنقیطی کا مقابلہ کر سکے۔ وہ بتاتے تھے کہ اس کے مزاج کا کوئی حساب ہی نہیں تھا اور وہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا اور یہ کہ اس کی زبان کی روانی ناقابل بیان تھی۔ انہوں نے اس کا ایک نام بھی رکھ لیا تھا۔ ''جذباتی مراتشی ان کا بیان تھا کہ وہ مدینہ میں رہا ہے اور استنبول اور ہسپانیہ بھی گیا ہے اور ان سے متعلق اس کے تجربات پر وہ اس کی نظمیں بھی سناتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس کے پاس مسودات کا ایک ذخیرہ ہے اور چھپی ہوئی کتابیں بھی ہیں۔ نہ صرف مصر کی بلکہ یورپ کی بھی۔ اس کے باوجود وہ اپنا زیادہ تر وقت نیشنل لائبریری میں پڑھنے اور لکھنے میں گزارتا تھا۔ پھر وہ ایک مشہور واقعہ پر قہقہہ لگاتے جس سے وہ کافی بدنام ہوا تھا اور جس سے آخر کار اسے سخت نقصان پہنچا تھا۔ اس کا سبب اس کا یہ نظریہ تھا کہ ''عمر'' اس منصرف ہے غیر منصرف نہیں جب پہلی بار اس نے یہ قصہ سنا تو لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لیکن ساری بات اس پر واضح

ہوگئی جب گرائمر پر اسے کچھ عبور حاصل ہو گیا اور جب اسے منعرف اور غیر منعرف اسموں کے درمیان فرق معلوم ہوا۔ نوجوانوں نے جو کہانی سنائی وہ یہ تھی۔ شیخ شنقیطی علماء کے مختلف حلقوں میں ''عمر'' کے منصرف ہونے کے بارے میں بہت بحثیں کرتا تھا۔ خصوصاً ایک مرتبہ وہ ریکٹر کی صدارت میں جمع ہوئے اور شیخ شنقیطی سے استدعا کی کہ وہ ''عمر'' کے منصرف ہونے کے متعلق اپنے نظریات کی وضاحت کرے۔ شیخ نے اپنے اکھڑ مراکشی لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک آپ شاگردوں کی حیثیت سے میرے قدموں میں نہ بیٹھیں۔'' اس پر علماء بڑے ششدر ہوئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے جو ذرا ہوشیار تھا۔ آگے بڑھا اور دوزانو ہو کر شیخ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ تب شنقیطی نے وضاحت شروع کی۔ اس نے کہا کہ خلیل نے یہ شعر نقل کیا ہے۔

تم جو عمر کو بدنام کرتے ہو
تم نے اس کے متعلق قصے گھڑ لئے ہیں

لیکن جو شیخ اس کے قدموں میں بیٹھا تھا اس نے اپنی باریک سی طنزیہ آواز میں کہا۔ میں کل خلیل سے ملا تھا اور اس نے مجھے یہ شعر دوسری طرح سنایا تھا۔ اس نے عمر کی گردان نہیں کی جیسے تم کرتے ہو۔ لیکن شنقیطی نے اس کی بات کاٹ ڈی۔ اس نے کہا۔ ''جھوٹے۔ خلیل کو مرے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ اور مردے سے کوئی کیسے بات کر سکتا ہے۔'' پھر اس نے علماء سے کہا کہ وہ اس کے مخالفین کو جھوٹا قرار دیں جنہیں نہ تقطیع کا پتہ ہے نہ گرائمر کا۔ لیکن اس درخواست پر ایک قہقہہ پڑا اور مجمع یہ طے کئے بغیر بکھر گیا کہ ''عمر منصرف ہے یا غیر منصرف۔''

جو کچھ اس کی سمجھ میں آیا اس میں لڑکے کو بڑا لطف ملا اور جو وہ سمجھ نہ سکا اس پر وہ خاصا حیران ہوا۔

شیخ اپنے شاگردوں کے ساتھ وہ نظم پڑھ رہا تھا جس کا نام ''معلقات'' ہے۔ لڑکے کا بھائی اور اس کے دوست جمعرات اور جمعہ کو اس کے درس میں جاتے تھے اور اسی طرح اپنا سبق یاد کرتے جس طرح درس تیار کرتے تھے۔ چنانچہ لڑکے نے پہلی مرتبہ سنا۔

دونوں ٹھہرو! اور مجھے اپنی محبوبہ اور اسکے گھرانے کا ماتم کرنے دو۔
ہاؤمل اور دخول میں ریت کے ٹیلوں کے درمیان۔

MashalBooks.org

لیکن افسوس۔ ان سینئر طالب علموں نے اتنے مشکل مضامین کو بہت جلد چھوڑ دیا۔لڑکے کے بھائی نے ''معلقات'' کو رٹنے کی بہت کوشش کی اور امراؤالقیس اور طرفہ کی نظموں تک پہنچ گیا جنہیں وہ زور زور سے دہراتا تھا۔ چنانچہ وہ لڑکے کو بھی زبانی یاد ہو گئیں۔ بدقسمتی سے وہ اس سے آگے نہ جا سکے اور اس نے یہ مضمون چھوڑ کر ایک عام سا مقبول مضمون لے لیا۔لیکن وہ دو نظمیں لڑکے کے ذہن پر نقش ہو گئیں گو ان کے معنی کا اسے قطعی کوئی اندازہ نہیں تھا۔

اعلیٰ درجوں کے طلباء نے اظہر میں دیئے جانے والے ایک اور درس کا ذکر کیا جو انشاء پر تھا اور جسے امام کا ایک رفیق ایک شامی شیخ دیتا تھا۔ کچھ عرصہ وہ اس میں جاتے رہے بلکہ انہوں نے کاپیاں بھی خرید لیں جن میں وہ متفرق موضوعات پر مضامین لکھتے تھے۔ گو کچھ عرصہ بعد انہوں نے پہلے کی طرح اس درس کو بھی چھوڑ دیا۔لڑکے کا بھائی ایک روز ''مقامات حریری'' لے آیا اور انہیں یاد کرنے لگا۔ اس نے بلند آواز میں یوں رٹنا شروع کیا کہ وہ لڑکے کو بھی یاد ہو گئے لیکن ابھی وہ دسویں مقامہ تک ہی پہنچے تھے کہ نوجوان شیخ نے اسے بھی ترک کر دیا جیسا کہ اس نے شاعری اور انشاء کو ترک کیا تھا اور فقہہ دینیات اور بنیادی اصولوں پر لگ گیا۔

ایک دفعہ وہ ایک موٹی سی کتاب لے کر آیا جس کا نام نہج البلاغہ تھا جو حضرت علی کے خطبات اور ان پر خود امام کی شرح پر مشتمل تھی۔ اس نے کچھ خطبات زبانی یاد کرنے شروع کر دیئے لیکن جلد ہی وہ اس کتاب سے بھی اکتا گیا۔ اس طرح لڑکا صرف چند خطبے ہی یاد کر سکا۔

بدیع الزماں الھمدانی کے ''مقامات'' کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن اسی زمانہ میں لڑکے نے ابوفراس کا ایک شعر سنا جسے وہ کبھی نہیں بھول سکا۔

میں نے تم میں وہ تحمل دیکھا ہے جو آنسوؤں کو ضبط کر سکے
لیکن کیا جذبات کا تم پر کوئی اثر نہیں
نہ تمہیں روکنے کے لئے نہ اکسانے کے لئے؟

اظہر کے نیم شاعروں نے اس نظم کو مشطرہ یا مخمسہ کر کے چھاپا تھا۔ اس کا بھائی ایک ایک شعر پڑھنے لگا۔ لیکن لڑکا بہت جلد بھرتی کے شعروں سے اکتا گیا اور پھر دونوں

نے اصل نظم کی طرف توجہ کی۔

لڑکا یہاں اس نظم کا صرف اس لئے حوالہ دے رہا ہے کہ اس نظم کو ادا کرتے ہوئے وہ اتفاقاً ابوفراس کے ایک اور شعر پر آیا جو اس کے کانوں کو بہت ہی عجیب لگا۔

میں خانہ بدوش نہیں تھا۔ مگر بدو بن گیا اس لئے
کہ جہاں تو نہیں وہ گھر بھی ہو تو صحرا ہے

لیکن نوجوان شیخ نے اس شعر کو بدل کر یوں اپنے بھائی کو پڑھایا۔

صحرانشیں۔ دوشیزہ۔ تم کون ہو۔

لڑکے کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اسے یہ بھی عجیب لگا کہ ''دوشیزہ'' کا لفظ یوں شعر آئے لیکن بعد میں۔ جب وہ بڑا ہوا اور باتیں سمجھنے لگا تو اسے یہ شعر صحیح طور پر پڑھنا اور سمجھنا آ گیا اور اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ ''دوشیزہ'' کا لفظ عباسی دور کے آخری شعراء نے شاعری میں داخل کر دیا تھا۔

ادب سے لڑکے کی واقفیت بہت ہی سرسری اور بے قاعدہ طریقہ سے ہوئی تھی۔ اس نے ادھر ادھر سے نظم و نثر کے کچھ ٹکڑے حاصل کر لئے تھے لیکن اس نے کسی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ جب بھی موقع ملا اس نے دو چار عبارتیں یا شعر یاد کر لئے اور پھر عام روش کے مطابق رسمی تعلیم میں لگ گیا۔

نئے تعلیمی سال کے شروع میں ایک روز نوجوان بڑے جوش میں گھر آیا عباس کے چھتے میں ادب پر جو درس اس صبح اس نے سنا تھا وہ اس سے سخت متاثر تھا بلکہ خصوصاً دیوان الحماسہ سے جو شیخ مرصفی پڑھ رہا تھا۔

وہ اس لیکچر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہاں سے واپسی پر راستہ میں اسی روز انہوں نے یہ کتاب خرید لی اور طے کیا کہ نہ صرف وہ تمام کورس مکمل کریں گے بلکہ اسے زبانی بھی یاد کریں گے۔ لڑکے کا بھائی بھی جوان باتوں میں آگے آگے رہتا تھا اس دیوان پر تبریزی کی شرح ڈھونڈنے کے لئے دوڑا۔ اس کتاب پر اس نے خوبصورت جلد بندھوائی جس سے اس کی الماری کی شان بھی بڑھ گئی اور وہ اس کو وقتاً فوقتاً پڑھنے لگا۔ اس نے دیوان کو زبانی یاد کرنا شروع کر دیا اور اس میں چھوٹے بھائی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ کبھی کبھی وہ تبریزی کی شرح بھی دیکھ لیتا تھا لیکن وہ اسے ایسے پڑھتا تھا جیسے یہ کوئی فقہہ کی

MashalBooks.org

کتاب ہو یا دینیات کی گرائمر۔

لڑکا فطرتاً لاشعوری طور پر محسوس کرتا تھا کہ شعروں کے دیوان کو یوں نہیں پڑھنا چاہئے۔ نوجوان شیخ اور اس کے دوست ''الحماسہ'' کو بھی ایک نصاب کی کتاب سمجھتے تھے اور تبریزی کو اس کی بنیادی شرح۔ انہیں یہ دیکھ کر مایوسی بھی ہوئی کہ اس شرح کا کوئی حاشیہ اس کتاب میں نہیں ہے۔

انہوں نے شیخ مرصفی کی فقرہ بازی کے بڑے دلچسپ قصے سنائے اور یہ کہ وہ اظہر کے علماء اور ان کی مرتب کی ہوئی کتابوں کا کتنا مذاق اڑاتا تھا لیکن اس کے لئے ان کی پسند میں ایک استہزا کا پہلو بھی تھا اور اس کے تمام طنز کے باوجود اظہر کی علمیت کے بارے میں ان کا یقین متزلزل نہیں ہوا۔

ان باتوں سے لڑکا اس کا گرویدہ ہو گیا اور اسکی زبردست خواہش ہوئی کہ وہ خود اس درس میں جائے لیکن ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ نوجوان نے جیسے اور بہت سے ادبی درس ترک کر دیئے تھے۔ اسے بھی چھوڑ دیا۔ اسے یہ کوئی سنجیدہ مضمون نہیں سمجھتے تھے کہ یہ اظہر کے بنیادی نصاب میں شامل نہیں تھا بلکہ ایک ثانوی حیثیت کا مضمون تھا جیسا امام نے ''جدید سائنسوں'' کے تحت رکھا ہوا تھا جس میں جغرافیہ، ریاضی اور ادب شامل تھے۔ اس کے علاوہ شیخ کے طنز کے نشتر بھی بہت تیز اور حد سے بڑھے ہوئے تھے۔

جیسے وہ ان کی نظروں سے گر گیا تھا ویسے ہی یہ بھی انہیں کسی لائق نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ادب کے مطالعہ کے اہل نہیں ہیں جس میں بحث و تکرار سے زیادہ ذوق سلیم کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ صحیح معنوں میں عالم نہیں ہے اور صرف شعر پڑھ سکتا ہے اور لطیفے سنا سکتا ہے۔

تاہم وہ اس درس میں بڑی باقاعدگی سے آتے تھے اس لئے کہ شیخ امام کا قریبی دوست تھا اور اسے اس کی حمایت حاصل تھی۔ شیخ بھی امام کی شان میں قصیدے لکھنے کے مواقع کی تلاش میں رہتا۔ انہیں پیش کرنے کے بعد وہ طالب علموں کو یہ قصیدے لکھوا دیتا اور ایک دو کو انہیں زبانی یاد کرنے پر بھی مجبور کرتا گویا یہ بڑے اعلیٰ پائے کی نظمیں تھیں۔ ان کو واقعی بہت پسند کیا جاتا تھا۔ لیکن محض امام کے قصیدے ہونے کی وجہ سے۔

نوجوانوں نے اس درس میں باقاعدگی سے حاضر ہونے کی بہت کوشش کی لیکن

ان میں اتنی استقامت نہیں تھی۔ آخر انہوں نے اسے خیر باد کہا اور گھومتے گھماتے سہ پہر کی چائے پر آ گئے جو وہ اب بڑے آرام سے پی سکتے تھے۔ چنانچہ ''حماسہ'' کا خاصا حقہ پڑھ چکنے کے بعد لڑکا کچھ عرصہ کے لئے ادب سے محروم ہو گیا۔ پھر ایک روز یہ خبر آئی کہ شیخ مرصفی ہفتہ میں دو روز زمشخری کی گرائمر ''مفصل'' پڑھایا کرے گا۔ لڑکا اس نئے درس میں گیا اور ایک دو حاضریوں کے بعد وہ شیخ سے اتنا محظوظ ہوا کہ وہ اس ادبی درس میں بھی شامل ہوا۔ اس دن کے بعد سے وہ اس کا مرید ہو گیا

لڑکے کا حافظہ بہت اچھا تھا اور وہ شیخ کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو ذہن میں محفوظ کر لیتا اور کسی خیال یا تشریح کو بھی نہ بھولتا۔ کئی مرتبہ شیخ کوئی شعر پڑھتا اور کئی ایسے الفاظ سمجھاتا جن کی وہ پہلے بھی تشریح کر چکا تھا یا کبھی کوئی قصہ یا لطیفہ دہراتا۔ ایسے موقعوں پر خود اپنی یادداشت سے ہر بنی ہوئی بات کو دہراتا۔ شیخ کے لطیفے۔ اس کی تشریحیں اور اس کے نظریات اور خیالات۔ مرتین وشارحین پر اس کے اعتراضات اور ابوتمامہ کے اقتباسات۔ کچھ بھی ہو لڑکا سب کچھ یاد رکھ سکتا تھا اور اسے دہرا سکتا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ شیخ لڑکے کو پسند کرنے لگا تھا اور لیکچرز کے درمیان اس سے بحث میں مصروف رہتا۔ بعد میں اس نے اسے بلایا اور اظہر کے دروازے تک چھوڑنے گیا بلکہ سڑک پر بھی اس کے ساتھ چلنے کی کوشش ظاہر کی۔ ایک روز وہ اسے اتنی دور تک لے گیا کہ چند طالب علموں کے ساتھ جوان کے ہمراہ تھے وہ لب سڑک ایک قہوہ خانہ میں بیٹھ گئے یہ لڑکے کا کسی قہوہ خانہ میں جانے کا پہلا موقع تھا۔ وہ وہاں دوپہر سے عصر تک بیٹھا رہا۔ لڑکا بڑا خوشی خوشی گھر واپس آیا۔ بڑی تقویت اور امید کے ساتھ۔

حجرہ درس سے باہر شیخ کا ایک ہی موضوع تھا۔ اظہر۔ اس کے شیخ اور ان کا غلط طریق تدریس۔ جب کبھی بھی یہ موضوع چھیڑتا تو شیخ بڑی جلی کٹی سناتا۔ وہ اساتذہ اور اپنے ہم عصروں پر بے لاگ تنقید کرتا۔ لیکن ان تمام باتوں سے اس کے شاگرد اسے اور بھی پسند کرنے لگتے۔ لڑکے پر خصوصاً اس کا اثر بہت گہرا اور دیرپا تھا۔

آہستہ آہستہ لڑکا اس درس کو باقی سب سے زیادہ پسند کرنے لگا اور دوسرے دو طالب علم جو شیخ سے بہت قریب تھے اس کے دوست بن گئے اور بعد میں اس کے دیرینہ ساتھی ثابت ہوئے۔ وہ صبح کے وقت شیخ کے درس میں ملتے اور پھر وہاں سے قدیم ادب کا

مطالعہ کرنے نیشنل لائبریری چلے جاتے اور شام تک وہیں رہتے ۔ جب وہ اظہر واپس آتے تو انتظامی شعبہ اور عباس کے چھتے کے درمیان کے راستہ میں بیٹھ جاتے ۔ یہاں وہ اپنے استاد کے متعلق اور ان کتابوں کے متعلق جوانہوں نے لائبریری میں پڑھی تھیں گفتگو کرتے ۔ پھر دوسرے استادوں کا مذاق اڑانے لگتے اور اظہر آنے جانے ایسے تقریباً ہر شیخ اور طالب علم پر ہنستے ۔مغرب کی نماز کے بعد وہ عباس کے چھتے میں جاتے اور تفسیر قرآن کے درس میں شریک ہوتے جو امام کے انتقال کے بعد اب شیخ بخیت کے ذمہ تھا۔

لیکن یہ تینوں شیخ بخیت کے درس کو دوسرے طلباء کی طرح نہیں سنتے تھے ۔ وہ صرف اس پر ہنسنے کے لئے آئے تھے اور اس کی غلطیاں نکالتے تھے جوخصوصاً اس وقت زیادہ ہوتیں جب وہ ادب یا زبان کی بات کرتا انہیں سب سے زیادہ مزہ اس وقت آتا جب وہ بعد میں اکٹھے ہوتے اور اس کی فاش غلطیوں پر ہنستے اور اگلے روز شیخ مرصفی کو ان کے متعلق بتاتے ۔ جسے طنز کے لئے نیا مواد مل جاتا اور اس کے رفقاء کا راس کا نشانہ بنتے ۔

اظہر میں تینوں دوستوں کا دم گھٹتا تھا اور اس شیخ نے بلکہ اس کی تعلیمات نے اس احساس کو اور بھی شدید کر دیا تھا۔ وہ اس قید سے نکلنا چاہتے تھے ۔آزاد ہونا چاہتے تھے اور جب شیخ مرصفی ان کو پڑھتا تھا تو ان کی زنجیریں ہوا میں تحلیل ہوتی ہوئی محسوس ہوتیں ۔

میرا خیال ہے کہ دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو آزادی کی اتنی تڑپ پیدا کر سکے ۔خصوصاً نوجوانوں میں ۔ جتنا کہ ادب ۔ اور وہ بھی شیخ مرصفی کا پڑھایا ہوا ادب جب وہ ''حماسہ'' پڑھاتا یا بعد میں ''کامل'' پر درس دیتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تعلیم کی نوعیت کیا ہے؟ شاعر ۔ مرتب اور شارح پر بے لاگ تبصرہ خصوصاً مختلف ماہرین لسانیات پر ۔ پھر ادب میں جمالیاتی عناصر کی دریافت کے لئے ذوق سلیم کی پرکھ اور اس کا اطلاق ۔نثر میں شعر میں ۔ معنی و مطالب میں ۔تسلسل و روانی میں اور ایک ایک لفظ کی نشست میں اس سے بھی زیادہ عہد حاضر کی وہ حس جو اس کے حلقہ کی فضاء کی خصوصیت تھی اور اظہر کے گھٹیا مذاق اور تھکی تھکی ذہانت اور ان کے مقابلہ میں قدما کی نفاست اور فراست، ان کا اثر یہ تھا کہ اظہر کی زنجیریں ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جاتی تھیں ۔ ان سے ایک کراہت پیدا ہوتی تھی ۔ جو اصولاً بالکل جائز تھی لیکن کبھی کبھی ناروا بھی تھی ۔ وہ کراہیت جو شیخ صاحبان کے ذوق ۔ ان کی علمیت ان کی گفتگو اور ان کے طور طریقوں سے پیدا ہوتی تھی ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیوں اس تمام ہجوم میں سے جو شروع شروع میں اس کے درس میں آیا آخر میں صرف ایک چھوٹا سا حلقہ ہی باقی رہ گیا۔ جن میں خاص طور سے یہ تین دوست نمایاں تھے۔ یہ ایک مختصر سا گروہ تھا لیکن جلد ہی یہ سارے اظہر میں بدنام ہو گئے خصوصاً علماء اور طلباء میں اور سب سے زیادہ اظہر پر تنقید کرنے میں۔ روایات کی تحقیر کرنے میں اور اس سے بھی زیادہ یہاں کے لوگوں پر ہجو یہ نظمیں لکھنے کے سلسلے میں۔ چنانچہ اظہر ان سے متنفر ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ان سے خوفزدہ بھی تھا۔

شیخ مرصفی محض ایک استاد ہی نہیں تھا وہ ایک وسیع کلچر کا انسان تھا۔ بات چیت میں اور اظہر میں اپنے درس کے دوران ایک عالم شیخ کا وقار ملحوظ رکھتا تھا۔ لیکن جب وہ تنہا اپنے حلقہ میں ہوتا تو بڑا انسان نواز ہوتا۔ ہر موضوع پر کھل کر گفتگو کرتا۔ نظم ونثر کے حوالے دیتا۔ قدما کی زندگی کی مثال دیتا اور ثابت کرتا کہ وہ بھی اتنے ہی آزاد اور صاف گو تھے جتنا وہ خود ہے اور وہ ہر ایک کے متعلق اسی طرح بے جھجک اور بے ساختہ پن سے گفتگو کرتا جیسے خود اپنے متعلق عقیدت رکھتے تھے اور اس کے مداح تھے۔ وہ اسے مصیبتوں کے درمیان صبر کا نمونہ سمجھتے تھے۔ اس میں بڑی قناعت تھی۔ وہ غیر عملی مشاغل میں نہیں پڑتا تھا اور اس قسم کے گناہوں سے دور رہتا تھا جیسے سازش، غیبت، بناوٹ اور سب سے زیادہ خوشامد پسندی۔

انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بلکہ صریحاً محسوس کیا تھا کہ وہ ایسا ہی تھا۔ کیا انہوں نے اس کے گھر جا کر اسکے ساتھ زندگی کے طور طریقے نہیں دیکھے تھے۔ یہ جارت میں ایک پرانا بوسیدہ گھر تھا جو باب الجر کے نزدیک ایک گندی گلی میں واقع تھا۔ وہاں اس گلی کے آخر میں ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں شیخ مرصفی رہتا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک تنگ و تاریک راستہ تھا جو سخت متعفن ہونے کے علاوہ سوائے ایک بنچ کے قریباً بالکل خالی تھا۔ یہ لمبی سی، پتلی سی، خالی بنچ، دیوار سے لگی ہوئی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اپنے شاگردوں کو خوشامد کہنے کے بعد شیخ اس سخت بنچ پر بیٹھ جاتا۔ تاہم وہ بہت خوش اور مطمئن ہوتا اور سب کی باتوں کو ایک شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ سنتا۔ یا ان سے بڑے دلکش انداز میں اور بے مثال خلوص اور بشاشت کے ساتھ گفتگو کرتا۔ کبھی کبھی جب وہ اس سے ملنے آتے تو وہ مصروف ہوتا۔ ایسی صورت میں انہیں اپنے کمرے میں بلا لیتا۔

اس تک پہنچنے کے لئے انہیں ایک نہایت بوسیدہ پرانے زینہ پر چڑھنا ہوتا جس کے بعد وہ ایک خالی راستہ سے گزرتے جہاں دھوپ بھری ہوتی۔ کمرے میں داخل ہوکر انہیں ایک خمیدہ کمر بوڑھا نظر آتا جو بیسیوں کتابوں کے درمیان فرش پر بیٹھا ہوتا جن میں وہ کسی ایک ٹکڑے کو تلاش کررہا ہوتا جسے وہ مکمل کرنا چاہتا تھا۔ کوئی لفظ۔ کوئی شعر جس کو جانچنا چاہتا تھا یا اس کی تشریح کرنا چاہتا تھا۔ یا پھر کسی حدیث کے متعلق غور کررہا ہوتا۔ اس کے دائیں ہاتھ قہوہ کا سامان پڑا ہوتا۔ جب وہ آتے تو ان کے لئے کھڑا نہ ہوتا لیکن ہمیشہ ان کے آنے پر خوشی کا اظہار کرتا۔ وہ کہتا کہ جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ اور پھر ایک کو قہوہ بنانے اور سب کو پیش کرنے کے لئے کہتا۔ پھر چند منٹ ان سے باتیں کرنے کے بعد وہ انہیں اپنی تحقیق میں شامل ہونے کی دعوت دیتا جس میں وہ اس وقت مصروف تھا۔

شیخ کے ساتھ ایک ملاقات ایسی تھی جسے یہ نوجوان اور اس کے دو ایک دوست کبھی نہیں بھلا سکتے تھے۔ ایک روز عصر کی نماز کے قریب وہ اس کے کمرے میں گئے اور اسے دہلیز پر ایک چھوٹے سے گدھے پر بیٹھا ہوا پایا۔ اس کے پاس ایک سوکھی ہوئی سی بوڑھی عورت بیٹھی تھی جو بڑھاپے کی وجہ سے تقریباً دوہری ہوگئی تھی۔ شیخ اسے کھانا دے رہا تھا۔ جب اس نے ان دو طالب علموں کو دیکھا تو بڑے تپاک سے انہیں خوش آمدید کہا اور انہیں کمرے میں انتظار کرنے کے لئے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں آیا اور معذرت کی اور پھر مسکرا کر کہا۔ ''میں اسے کھانا دے رہا تھا۔ یہ میری ماں ہے''

گھر سے باہر شیخ مرصفی وقار اور تحمل کا نمونہ تھا۔ ہمیشہ پرسکون۔ مطمئن اور سنجیدہ وہ آسائش اور خوشحالی کی تصویر نظر آتا اور گفتگو میں یوں محسوس ہوتا کہ آپ ایک بڑے خوش نصیب سے مخاطب ہیں جسے دنیا کی تمام سہولتیں اور مسرتیں حاصل ہیں۔

لیکن اس کے شاگرد اور قریبی دوست حقیقت سے واقف تھے۔ وہ دراصل بہت غریب اور انتہائی مفلوک الحال شخص تھا۔ ہفتوں وہ سوائے اظہر سے ملنے والے راشن کو نمک کے ساتھ کھانے کے علاوہ کچھ اور نہ کھاتا۔ اس کے باوجود وہ ایک بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلا رہا تھا جب کہ دوسرے اظہر کے طلباء کی طرح بڑے اطمینان کی زندگی گزار رہے تھے اور بیٹی کو تو اس کے لاڈ نے تقریباً خراب ہی کردیا تھا۔

یہ سب کچھ وہ ڈھائی پونڈ فی ماہ کے معمولی سے وظیفہ سے پورا کرتا۔ اس کی اول

درجے کی سند اسے صرف ڈیڑھ پونڈ دلاسکی جب کہ ادب کے درس سے جو امام نے اسے دیا تھا اسے دو پونڈ اور مل جاتے۔ وہ اسے مہینہ کے آخر میں اپنا وظیفہ لیتے ہوئے شرم آتی تھی اسے یہ قطعی اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ شیخ صاحبان کے ہجوم میں جو ہمیشہ خازن کے سر پر سوار رہتے اپنا وظیفہ طلب کرے۔ چنانچہ وہ اپنی مہر اپنے کسی خاص شاگرد کو دے دیتا جو اس کا یہ معمولی سا وظیفہ صبح صبح لے آتا اور شام کو اس کے پاس پہنچاتا۔

یہ تھا شیخ کی زندگی کا انداز جو اسکے شاگردوں نے دیکھا اور جس میں انہوں نے اس کا ہاتھ بٹایا۔ سخت لیکن پروقار اور آزاد۔ اس کے برعکس دوسرے شیخ صاحبان کے رویہ پر انہیں سخت غصہ آتا اور حقارت کا احساس پیدا ہوتا۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں شیخ مرصفی نے ان کے دل موہ لئے اور نہ صرف اس کے طور طریقہ بلکہ اظہر والوں کے لئے اس کی حقارت اور ان کے فرسودہ روایات کے خلاف اس کی بغاوت میں بھی اس کی پیروی کرنے لگے۔

اسی زمانہ میں اس کے شاگرد اسے کوئی الزام نہ دے سکے سوائے اس کے کہ ایک مرتبہ امام سے اس کی وفاداری میں کچھ فرق آ گیا تھا۔ شیخ شربنی کے ریکٹر مقرر ہونے کے موقع پر اس نے نئے سربراہ کے لئے ایک قصیدہ لکھا جس کا وہ شاگرد اور منظور نظر تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شربنی اس کی مدح اور عقیدت کا حقدار تھا۔ شیخ مرصفی نے یہ نظم اپنے شاگردوں کو لکھائی۔ اس کے عنوان ''آٹھواں معلقہ'' کی وجہ سے اس کا موازنہ طرفہ کی نظم سے ہوتا تھا۔ جب وہ نظم لکھا چکا اور طلباء اس سے اس پر گفتگو کرنے کے لئے آئے تو وہ اپنے استاد کی تعریف کر رہا تھا اور اس کا مقابلہ امام سے کرتا۔ البتہ اپنے کچھ شاگردوں کی تنقید سے گھبرا کر اس نے پوری عاجزی کے ساتھ ان سے معذرت طلب کر لی۔

یوں یہ تینوں طلباء کی شیخ مرصفی کی محبت اور اس کی مدح میں اتنے آگے نکل گئے کہ یہ خود ان کے لئے بھی اور شیخ کے لئے بھی بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔

انہوں نے شیخ صاحبان اور طلباء کا مذاق اڑانے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ وہ کھل کر قدیم ادب کو سراہنے لگے اور ان کے مقابلہ میں اظہر کی منظور شدہ نصاب کی کتابوں کو حقیر سمجھنے اور کہنے لگے۔ گرامر میں سیبویہ کی ''کتاب'' پڑھ رہے تھے یا مغل۔'' بلاغت میں عبدالقادر جرجانی کی دو کتابیں۔ اس کے علاوہ وہ قدیم شعراء کی نظموں کے دو مجموعے بھی

پڑھ رہے تھے جو انہوں نے خود اپنے لئے چنے تھے کبھی کبھی وہ اس حد تک بھی چلے جاتے کہ اظہر میں سب کے سامنے ان مجموعوں میں سے عشقیہ نظمیں پڑھتے اور جب ملتے تو ایک دوسرے کو اپنے اشعار بھی سناتے۔ دوسرے طلباء اس کا بہت برا مناتے اور انتقام لینے کے موقع کے منتظر رہتے۔ البتہ کچھ نوعمر طلبہ ان کو سننے بھی آتے اور ان سے شعر و ادب کی تعلیم حاصل کرنے کے شوق کا اظہار بھی کرتے لیکن اعلیٰ درجہ کے طلباء میں ان کے مخالفین اور بھی آگ بگولہ ہوتے اور ان کے خلاف وہ سازشوں کے منصوبے بناتے۔

ایک دن ہمارا دوست اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ''مفصل'' کے درس کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ اس کے اس فقرے پر پہنچے۔ فقیہوں کے الحاج کو کفر کا مرتکب قرار دیا اس لئے کہ اس نے نمازیوں کی طرف یوں اشارہ کیا تھا جو روضہ نبی کے گرد طواف کر رہے تھے۔ یہ جس چیز کا احترام کر رہے ہیں وہ سوائے ہڈیوں کے ڈھیر اور چند لکڑیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔'' ہمارے دوست کا خیال تھا کہ ''حجاج کے اس فقرے میں کوئی ایسی بات نہیں جسے کفر پر محمول کیا جائے۔ اسے بے وقوف اور بدتمیز تو کہا جا سکتا ہے لیکن کافر نہیں''۔ کچھ طالب علم جنہوں نے یہ بات سنی سخت برہم ہوئے اور انہوں نے یہ بات سارے میں پھیلا دی۔

پھر ایک روز جب یہ تینوں شیخ عبدالحکم عطاء کے خطبہ میں بیٹھے تھے ان کو ریکٹر کے کمرے میں جانے کا حکم ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے وہاں گئے۔ انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے جب وہ شیخ حسونہ کے کمرے میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے دونوں طرف عمائدین حکما بیٹھے ہوئے تھے جو اظہر کی انتظامی کونسل کے رکن تھے اور جن میں شیخ بخیت۔ شیخ محمد حسنین عدوی۔ شیخ راضی اور دوسرے شامل تھے۔ ریکٹر نے بڑی تیزی نظروں سے انہیں دیکھا۔ اور رضوان کو۔ جو فراشوں کا جمعدار تھا کہا کہ ان لڑکوں کو بلائے جنہیں پہلے سے بٹھایا ہوا تھا۔ لڑکوں کی ایک ٹولی کو اندر لایا گیا۔ ریکٹر نے ان سے پوچھا کہ انہیں کیا کہنا ہے۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے تینوں دوستوں پر کفر کا الزام لگایا اور ثبوت کے طور پر حجاج کے متعلق ان کا بیان دہرایا اور ان کے متعلق کچھ اور بھی عجیب وغریب قصے سنائے۔

یہ لڑکا مانا ہوا مکار تھا۔ اس نے ان تینوں دوستوں کے خلاف الزام لگائے کہ

انہوں نے اظہر کے شیخ صاحبان کے متعلق بڑے رکیک الفاظ استعمال کئے ہیں ۔خصوصاً شیخ بخیت شیخ محمد حسنین شیخ راضی اور شیخ رفاعی کے خلاف جو سب وہاں موجود تھے اور خود اپنے کانوں سے سن رہے تھے کہ یہ لڑکے ان کے متعلق کیا کیا کہتے تھے۔ دوسرے طلباء نے ان بیانات کی تصدیق کی جب ان سے پوچھا گیا تو تینوں نے ہر بات کو قبول کیا۔ ریکٹر نے ان سے کوئی بات نہ کی ان کی طرف دیکھا۔ اس نے صرف رضوان کو بلایا اور ایک لخت اسے ان کے نام خارج کرنے کو کہا۔ اس لئے کہ وہ اظہر میں اس طرح کی بکواس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے بعد انہیں نکال دیا گیا۔ وہ بڑے افسردہ اور سخت حیران و پریشان کہ وہ یہ خبر اپنے والدین کو کس طرح سنائیں گے۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ بے شک طلبا نے ان کا مذاق اڑایا اور ان کی بے عزتی پر بڑی بغلیں بجائیں۔ لیکن مصیبت تو ابھی آنی تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ شیخ مرصفی سے ملنے اور کامل پر اس کا درس سننے گئے لیکن جونہی شیخ وہاں پہنچا رضوان آیا اور اس نے
نہایت اخلاق سے اطلاع دی کہ ریکٹر نے ''کامل'' درس منسوخ کر دیا ہے اور اس نے
نہایت اخلاق سے اطلاع دی کہ ریکٹر نے ''کامل'' درس منسوخ کر دیا ہے اور اگلی صبح وہ اپنے مطالعہ کے کمرہ میں اس کا انتظار کرے گا۔ شیخ بہت اداس وہاں سے چلا گیا اور تینوں نوجوان بھی۔ افسردہ اور شرمسار۔ اس نے انہیں تسلی دینے کی بہت کوشش کی لیکن جب وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے تو انہیں خیال آیا کہ وہ شیخ بخیت کے پاس جائیں۔ اس سے معافی مانگیں اور درخواست کریں کہ وہ ریکٹر سے ان کی سفارش کرے۔ شیخ نے کہا کہ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا۔ یہ بڑی حماقت کی بات ہوگی۔ لیکن انہوں نے اس نصیحت پر عمل نہ کیا اور شیخ بخیت کے گھر چلے گئے۔ اس نے فوراً ہی انہیں پہچان لیا اور مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔ پھر بڑے تحمل کے ساتھ انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کو کہا۔ انہوں نے اپنے دفاع کی کوشش کی لیکن اس نے صرف اتنا کہا کہ کیا وہ مبرد کی ''کامل'' نہیں پڑھ رہے ہیں؟ مبرد معتزلی تھا اور اس کو پڑھنا گناہ ہے۔

وہ یہ بھول گئے کہ وہ اس کے ساتھ صفائی کرنے کی غرض سے آئے تھے اور یوں زور زور سے بحث کرنے لگے کہ وہ پریشان ہوگیا۔ جب وہ رخصت ہوئے تو شیخ بخیت سخت برہم تھا اور وہ بہت مایوس۔ البتہ وہ اس کی کچھ باتوں پر بہت ہنسے اور رخصت ہوتے

MashalBooks.org

ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس واقعہ کی اطلاع اپنے والدین کونہیں دیں گے اور اپنا معاملہ قسمت پر چھوڑ دیں گے۔

اگلے روز وہ شیخ مرصفی سے ملے اور اس سے معلوم ہوا کہ ریکٹر نے ''کامل'' پڑھنے کی قطعی ممانعت کر دی ہے اور اس کی جگہ ''معنی'' کے پڑھنے پر اصرار کیا جس کا مصنف ابن ہشام تھا۔ اس کے علاوہ اسے عباس کے چھنتے سے ہٹا کر اس کے لئے اظہر کی ڈیوڑھی میں ایک ستون مقرر کر دیا۔ مرصفی نے اس بے عزتی کا بدلہ ریکٹر کا مذاق اڑا کر لیا۔ اس نے کہا کہ فطرت نے اس شخص کو علم حاصل کرنے کے لئے نہیں بنایا تھا اور نہ ہی ریکٹر بننے کے لئے بلکہ اسے تو سائراکوس کی گلیوں میں شہد بیچنا چاہئے تھا۔ شیخ حسونہ کے دانت ٹوٹ گئے تھے اور سائراکوس کے ''س'' کو ''ث'' کی طرح پڑھتا تھا اور جب وہ قاہرہ کے لہجے میں بولتا تو ''ک'' کو چھوڑ دیتا اور ''و'' کو لمبا کھینچ دیتا۔ اس کے علاوہ وہ مم مم بھی کرتا تھا۔ شیخ حسونہ (مرحوم) کا نام ہی ''سائرائس کا شہد فروش'' پڑ گیا تھا جسے طلباء کبھی نہیں بھول پاتے تھے۔

لیکن سائراکوس کا یہ شہد فروش بہت سخت اور بات کا پکا تھا۔ اس سے سارے اساتذہ ڈرتے تھے جن میں شیخ مرصفی بھی شامل تھا۔ چنانچہ اس نے باقاعدہ ''مغنی'' کا درس شروع کر دیا۔ طلباء پہلے کی طرح پڑھتے رہے۔ انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ وہ کون سی کتاب پڑھاتا ہے۔ اتنا ہی کافی تھا کہ وہ پڑھے اور یہ سنیں اور جب وہ کچھ کہیں تو شیخ ان کی بات سنے۔ نوجوان اس سے اظہار ہمدردی کرنا چاہتا تھا لیکن استاد نے بڑی شفقت سے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نہیں۔ کچھ نہ کہو۔ مجھے زندہ رہنا ہے۔ اور بس'' جب سے وہ اظہر آیا تھا نوجوان کو کوئی ایک واقعہ بھی ایسا یاد نہیں جب وہ اتنا دکھی ہوا ہو۔ اس روز یہ تینوں دوست اپنے استاد سے بڑے دکھے ہوئے دل کے ساتھ رخصت ہوئے۔

بہر حال۔ ریکٹر کی دی ہوئی سزا کو سر جھکا کر قبول کرنے کی بجائے یہ اس کو ختم کرانے کی کوششیں کرتے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے ایک نے ہمت ہار دی۔ اس نے اپنے دو ساتھیوں کو چھوڑ کر موید کی مسجد میں پناہ لی جہاں وہ اس وقت تک دوستوں اور دشمنوں سب سے دور رہنا چاہتا تھا جب تک کہ یہ ہنگامہ دب نہ جائے۔ دوسرے نے اپنے

باپ کو یہ بات بتائی۔ جس نے اندر ہی اندر اپنے بیٹے کے لئے عرض صنداشتیں دینی شروع کر دیں لیکن اس نے اپنے دوست سے دغا نہیں کی۔ وہ روزانہ ایک ساتھ جاتا اور عباس کے چھتے اور انتظامیہ کے درمیان راستہ میں بیٹھ جاتے جہاں وہ اسی طرح اساتذہ اور طلباء پر ہنستے رہتے۔

جہاں تک ہمارے دوست کا تعلق ہے اسے اپنے بھائی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ اسے پتہ ہو ہی گیا تھا۔ مگر کیسے؟ یہ لڑکے کو معلوم نہ ہو سکا۔ اس نے نہ اسے برا بھلا کہا نہ موردالزام ٹھہرایا۔ بس اتنا کہا ''یہ تمہاری اپنی غلطی ہے۔ تم نے اپنی مرضی کی اور اب اس کا مزہ چکھو خواہ یہ کیسا ہی تلخ ہو۔'' نوجوان سے کسی نے ہمدردی نہیں کی۔ نہ اس نے کسی کی مدد مانگی نہ کسی کو ریکٹر سے سفارش کرنے کے لئے کہا۔ لیکن اس نے یہ کیا کہ اظہر کے خلاف ایک سخت مضمون لکھا۔ خصوصاً ریکٹر کے خلاف اور آزادی فکر کا مطالبہ کیا۔ اب اسے کیا چیز روک سکتی تھی جب کہ ''الجریدہ'' شائع ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس میں روزانہ آزادی فکر کی حمایت میں اداریے لکھے جاتے تھے۔

ہمارا دوست یہ مضمون ''الجریدہ'' کے ایڈیٹر کے پاس لے گیا جس نے بہت گرم جوشی اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس نے اسے پڑھا اور پھر کمرے میں موجود اپنے ایک دوست کے سپرد کر دیا۔ اس نے اس پر نظر ڈالی اور غصہ سے کہا ''اگر ابھی تک تمہیں اپنے گناہوں کی سزا نہیں ملی ہے تو یہ مضمون تمہیں ضرور برباد کر دے گا۔''

نوجوان جواب دینا چاہتا تھا لیکن ایڈیٹر نے آہستہ سے اسے روک دیا ''جس شخص سے تم گفتگو کر رہے ہو وہ حسن بے صبری اظہر میں جدید سائنسوں کے شعبہ کا انسپکٹر ہے''۔ اس نے مزید کہا تم چاہتے کیا ہو؟ ریکٹر پر کیچڑ اچھالنا۔ اظہر کو بدنام کرنا۔ یا اپنی سزا ختم کرانا؟'' لڑکے نے جواب دیا ''میں اپنی سزا ختم کرانا چاہتا ہوں اور میں وہ آزادی حاصل کرنا چاہتا ہوں جو میرا حق ہے۔'' ایڈیٹر نے کہا ''تو پھر یہ بات مجھ پر چھوڑ دو۔ اور اب کوئی فکر مت کرو۔''

نوجوان چلا گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد انہیں اطلاع ملی کہ ریکٹر نے ان کی سزا منسوخ کر دی ہے اور وہ ان کا نام خارج نہیں کر رہا ہے۔ وہ صرف انہیں تنبیہہ کرنا چاہتا تھا اور بس۔

اس کے بعد نوجوان باقاعدگی کے ساتھ ''الجریدہ'' کے ایڈیٹر سے ملتا رہا یہاں تک کہ یہ ملاقات روزانہ ہونے لگی۔ اسی کے دفتر میں نوجوان نے اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کیا اور عمامہ والوں کی دنیا سے نکل کر طربوش (ٹوپی والوں) کی دنیا میں شامل ہو گیا۔ جب کہ وہ دستار سے تنگ آ چکا تھا اور اس کے مقتضیات سے نالاں تھا لیکن معاشرہ میں اس کی ملاقات بڑے بڑے امراء اور بااثر لوگوں سے ہونے لگی گو وہ خود درمیانہ طبقہ کا ایک غریب آدمی تھا جو قاہرہ میں سخت بدحالی میں دن گزار رہا تھا اور یوں اسے زبردست فرق پر غور کرنے کا موقع ملا جو امیر اور آسودہ حال لوگوں اور غریب محنت کشوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

MashalBooks.org

۲۰

اظہر سے جس کی زندگی سے اسے گھن آتی تھی اور جہاں وہ ہر اس چیز سے محروم تھا جس کی اسے زبردست خواہش تھی۔ اس کی بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔ تعلیمی سال کے شروع ہونے پر قاہرہ میں آتے ہی اس کو بڑی بے چینی تھی کہ جلد ہی یہ سلسلہ ختم ہو جائے خدا ہی جانتا ہے کہ گرمیوں کے آثار نظر آتے ہی وہ کتنا خوش ہوا اور اس سارے علاقہ میں جہاں وہ رہتا تھا سخت تعفن پیدا ہو گیا جسے سورج کی گرمی نے ساری فضا میں پھیلا دیا یہاں تک کہ سانس لینا بھی دشوار ہو گیا اس موسم میں صبح یا شام کوئی بھی درس ایسا نہیں تھا خواہ وہ کسی بھی شیخ کا ہو جس میں وہ اونگھنے نہ لگتا ہوا اور پھر جب طالب علم ہنستے ہوئے یا ناراض ہوتے ہوئے اس کے گرد جمع ہوتے تو وہ ایک جھٹکے کے ساتھ چونک کر اٹھ کھڑا ہوتا۔

چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ گرمیوں کے آتے ہی اس کی طبیعت میں ایک شگفتگی اور بشاشت آ گئی۔ اس لئے کہ اب چھٹیاں قریب تھیں اور وہ جلدی ہی گاؤں چلا جائے گا اور اسے اظہر اور اسکی ہر چیز سے چھٹکارا مل جائے گا چھٹیوں کا انتظار اسے صرف اسی لئے نہیں تھا اور نہ اس لئے تھا کہ وہ دوبارہ اپنے لوگوں سے ملے گا اور ان چیزوں کا لطف اٹھائے گا جن سے وہ قاہرہ میں محروم رہا۔ ان سب کے علاوہ اس انتظار کی ایک خاص وجہ بھی تھی جو باقی تمام وجوہات سے زیادہ اہم تھی جو روح اور ذہن دونوں کے لئے اظہر میں گزارے ہوئے ایک پورے تعلیمی سال سے زیادہ بامعنی تھی۔

چھٹیوں میں اسے سوچنے کا موقع ملتا اور اس کا اسے بڑا فائدہ ہوتا۔ پھر اسے اپنے بھائیوں کے ساتھ پڑھائی کرنے کا موقع ملتا اور ان کا مطالعہ کتنا بھرپور اور متنوع تھا۔

MashalBooks.org

گھر کے نوجوان چھٹیوں میں اپنے مدرسوں اور دوسرے اداروں سے لوٹ کر آتے ان کے تھیلے کتابوں سے بھرے ہوتے جن کا ان کی پڑھائی سے کوئی تعلق نہ ہوتا اور جس کے پڑھنے کا وہاں وقت نہ ہوتا۔ ان میں سنجیدہ کتابیں بھی ہوتیں اور تفریحی بھی۔ ان میں ترجمے بھی شامل ہوتے۔ طبع زاد کتابیں بھی ہوتیں جو جدید بھی ہوتیں اور قدیم بھی۔

گھر میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد وہ بیکاری سے تنگ آجاتے مستی کو چھوڑ کر وہ کتابوں کی طرف متوجہ ہوتے اور سارے دن ان میں لگے رہتے اور آدھی رات تک پڑھتے رہتے۔ ان کا باپ اس سے بہت خوش ہوتا اور انہیں شاباش دیتا۔ گو جب کبھی وہ لوگ کہانیاں پڑھتے ''الف لیلہ'' میں مشغول ہو جاتے یا عشرہ اور سیف بن ذی یزن کی کہانیوں میں وقت ضائع کرتے تو وہ ان سے ناراض ہوتا اور انہیں ڈانٹتا۔

لیکن گھر والے چاہیں یا نہ چاہیں وہ ان کتابوں کو بڑے شوق سے پڑھتے اور ان میں انہیں اظہر کی نصاب کی کتابوں سے دگنا زیادہ لطف آتا۔ اس کے علاوہ انہوں نے فرانسیسی سے فتحی زغلول کے ترجمے پڑھے اور انگریزی کے مباعی کے الہلال میں جرجی زیدان کے مضامین۔ اس کے ناول اور ادب وتہذیب پر اس کی تحریریں پڑھیں اور پھر مقتعف میں یعقوب صروف کی تحریریں اور لامنار میں شیخ رشید رضا کی۔

پھر انہوں نے قاسم امین کی کتابیں پڑھیں اور امام کی تحریریں بھی اور عربی میں ترجمہ کئے ہوئے عام پسند کے ناول بھی جن میں پیش کئے ہوئے عیشو عشرت سے بھرپور عجیب وغریب انداز زندگی سے وہ جیسے ایک سحر میں آجاتے۔ ایسی زندگی نہ انہوں نے گاؤں میں دیکھی تھی نہ شہر میں۔ ان سب باتوں نے ان میں یہ اشتیاق پیدا کیا کہ وہ اپنے مطالعہ کو وسیع کریں اس حد تک کہ صرف ان کے لئے ہی نہیں گھر والوں کے لئے بھی یہ تشویشناک ہو جائے۔ جب بھی وہ کسی غیر مانوس کتاب کا اشتہار دیکھتے وہ پرانی ہو یا نئی۔ فوراً ہی پبلشر کو آرڈر بھیج دیتے۔ زیادہ دن نہ گزرتے کہ کتاب یا کتابیں۔ پارسل سے آجاتیں اور گھر والے طوعاً کرہا'' ان کو وصول کر ہی لیتے۔

چھٹیوں کی جو ایک اور خوشی لڑکے کو ہوتی وہ بچھڑے ہوئے دوستوں کے متعلق سوچنے کی فرصت تھی۔ وہ انہیں خط لکھتا اور ان کے جوابات وصول کرتا۔ اس خط وکتابت سے اسے بڑی تسلی ہوتی اور اتنی زیادہ تقویت محسوس ہوتی جو قاہرہ میں ان کے ساتھ گفتگو

کرنے سے کہیں زیادہ تھی۔

پھر خاندان سے باہر دوسرے نوجوانوں سے ملنے کا مزہ ہوتا۔ یہ طربوش کی دنیا کے لوگ تھے۔ ان میں کچھ سیکنڈری سکولوں یا اعلیٰ تربیتی سکولوں سے اسی کی طرح چھٹیوں میں آرام کرنے آئے۔ ان سے ملنے اور باتیں کرنے میں بڑا لطف آتا تھا اور بھی اس سے باتیں کر کے بہت خوش ہوتے۔ وہ ایک دوسرے سے پڑھائی کے متعلق بڑے سوالات کرتے کبھی وہ اپنی کتابوں میں سے اسے پڑھ کر سناتے یا وہ ان کو کسی ادبی کلاسک کے متعلق بتلاتا۔

ان میں سے ایک چھٹیاں کچھ اتنی دلچسپ نہیں گزاریں۔ گھریلو حالات کے بدلنے کی وجہ سے انہیں وہ شہر چھوڑنا پڑا جولڑکے کی جائے پیدائش تھا اور پہلے وہ اس علاقہ کے انتہائی جنوبی حصہ میں منتقل ہوئے پھر ایک سال وہاں رہائش کے بعد بالائی مصر کے ایک دور افتادہ حصہ میں چلے گئے جہاں ان کا قیام خاصا طویل رہا۔ ہمارے دوست کو اپنے وطن کے چھٹنے کا بہت دکھ ہوا اور ان اجنبی غیر مانوس جگہوں میں وہ خوش نہیں رہا جہاں کے اسے راستے بھی معلوم نہیں تھے۔ لیکن آخر کار اس نے انتہائی جنوب کے اس شہر میں دل لگا لیا جس کو وہ دوسرے وطن کی طرح جانتے اور پسند کرنے لگا۔ تاہم اس شہر سے اس کا پہلا سابقہ حد درجہ تکلیف دہ تھا۔

وہ سب گھر والوں کے ساتھ اپنے باپ کے پاس وہاں چلا گیا جہاں اس نے اکیلے ہی کام شروع کر دیا تھا۔ جب وہاں اس نے اپنا ٹھکانہ بنا لیا اور سب انتظامات کر لئے تو گھر والوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ یہ سب کچھ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہوا اس لئے لڑکا بھی ان کے ساتھ گیا۔ آدھی رات کے وقت وہ ریل میں سوار ہوئے اور دوسرے روز صبح چار بجے اپنی منزل پر پہنچے۔ یہ ایک نوتعمیر شہر تھا اور ریل وہاں صرف ایک منٹ کے لئے ٹھہری۔ کنبہ خاصا بڑا تھا عورتوں اور بچوں کے علاوہ سامان بھی بہت تھا اور ان سب کی نگرانی بڑا لڑکا کر رہا تھا۔ جیسے ہی ریل سٹیشن کے قریب پہنچنے لگی بڑے بیٹوں نے سامان اور عورتوں اور بچوں سب کو دروازے کے قریب جمع کر لیا۔ یوں جب ریل سٹیشن پر پہنچی تو جلدی جلدی انہوں نے سب کو پلیٹ فارم پر اتار دیا اور پھر خود بھی نیچے کود پڑے۔ نہ کوئی چیز بھولی نہ وہاں رہی سوائے نابینا لڑکے کے۔

وہ خود کو تنہا اور بے یار و مددگار پاکر بہت ڈرا البتہ کچھ مسافروں نے اس کو مشکل میں دیکھ کر ترس کھایا اور اسے حددرجہ تسلی دی۔ جب ریل دوسرے سٹیشن پر رکی تو اسے وہاں اتار دیا اور تار گھر کے آدمی کے حوالہ کر دیا پھر یہ لوگ ڈبے میں لوٹ گئے۔

لڑکے کو بعد میں معلوم ہوا کہ گھر والے اپنے نئے مکان میں پہنچ گئے تھے اور اس کا جائزہ لے رہے تھے ایک ایک کمرہ کا جائزہ لے کر وہ چیزوں کے ان مقام پر رکھتے جا رہے تھے پھر ان کا باپ آیا اور بیٹوں بیٹیوں سے باتیں کرنے بیٹھ گیا۔

سب کے پہنچنے کے کافی دیر بعد باتوں باتوں میں اتفاقاً لڑکے کا نام آ گیا۔ اس کے ماں باپ اور بھائی ایک دم سے پریشان ہو گئے۔ بڑے لڑکے فوراً تار گھر کی طرف دوڑے لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی کافی وقت گزرنے کے بعد یہ اطلاع ملی کہ وہ اگلے سٹیشن پر تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ کوئی آ کر اسے لے جائے۔ چنانچہ ان میں سے ایک گیا اور اسے ایک بے ہنگم سے خچر کی کاٹھی پر بٹھا کر لے آیا جو کبھی آرام آرام سے چلتا اور کبھی تیز تیز دوڑنے لگتا جس سے اسے سخت کوفت ہوتی۔

لڑکا وہ وقت کبھی نہیں بھول سکے گا جو اس نے ٹیلیگراف آپریٹر کے ساتھ گزارا۔ وہ بڑا زندہ دل انسان تھا اور ہنسی مذاق سے پر تھا۔ اس کا کمرہ سٹیشن کے ملازمین کے ایک ہجوم کی بیٹھک تھا۔ جو پہلے تو نوجوان کی وہاں موجودگی سے خوش نہیں تھے لیکن جب انہوں نے اس کی کہانی سنی تو اس سے ہمدردی کرنے لگے۔ اپنے سامنے ایک نابینا شیخ کو پا کر انہوں نے سمجھا کہ وہ ایک اچھا قاری قرآن ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے گانے کی فرمائش کی جب اس نے معذرت چاہی کہ اسے گانا نہیں آتا تو انہوں نے اس سے قرآن کی تلاوت کی فرمائش کی اور گو اس نے قسمیں کھا کہ اس کی آواز تلاوت کے لئے موزوں نہیں ہے انہوں نے اصرار کیا اور کوئی بہانہ قبول نہ کیا۔ چنانچہ لڑکے نے مجبوراً تلاوت شروع کی اسے بہت شرم آ رہی تھی اور اس کا دل اس وقت سخت کرب محسوس کر رہا تھا۔ وہ زندگی پر لعنت بھیج رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کاش وہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ اس کی آواز گلے میں اٹک گئی اور آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ تب آخر کار انہیں اس پر رحم آیا اور وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلے گئے۔

اس حادثہ سے گو لڑکے کا دل بہت دکھا لیکن اسے اپنا نیا گھر برا نہیں لگا نہ اسے

وہاں آنے کا افسوس ہوا۔ بلکہ وہ اس سے محبت کرنے لگا اور گرمیوں کی آمد پر وہ وہاں جانے کے لئے بےقرار رہتا گو گرمی سخت نا قابل برداشت تھی۔

قاہرہ کی رہائش گاہ میں کافی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ پرانے طلباء میں سے دو کو ڈاکٹری کی سند مل گئی تھی اور باقی جن میں اس کا بھائی بھی شامل تھا۔ قضا کے نوتعمیر سکول میں داخل ہو گئے۔

نوجوان ایک مرتبہ پھر اسی بے رحم تنہائی میں اسیر ہو گیا جو اس کی طالب علمانہ زندگی کے شروع کے چند مہینوں میں اس کیلئے سخت کوفت کا باعث ہوئی تھی۔ اب تو یہ زندگی اس سے بھی زیادہ بری تھی کہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد قاہرہ واپس پہنچنے پر کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا۔ اس کا بھائی مدرسہ قضا میں چلا جائے گا اور اس کا خالہ زاد دارالعلوم میں۔ وہ وہاں اکیلا کس طرح رہے گا۔ قاہرہ جانے میں اس کا یا کسی اور کا کیا فائدہ تھا۔ وہ پہلے ہی کافی علم حاصل کر چکا تھا۔ ڈاکٹری کی سند سے اسے کیا حاصل ہوگا۔ اگر وہ اسے مل بھی گئی زیادہ امکان یہ تھا کہ وہ فیل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ کامیابی کے لئے جتنی محنت درکار تھی وہ تنہا نہیں کر سکتا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں کے اختتام کے قریب اس کے بھائی نے گھر والوں کو یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا باپ جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ ان دلائل کے سامنے خاموش ہو گیا۔ اس کی ماں بھی کوئی جواب نہ دے سکی اور صرف چپکے چپکے روتی رہی۔ لڑکا صرف ٹھوکریں کھانے کے لئے وہاں ایک کمرہ میں تنہا رہا جاتا۔ اداس دل شکستہ اور اسکا ذہن خالی ہوتا۔

رات بہت طویل اور تکلیف دہ تھی اور اپنی بیچارگی پر اس کا دل دکھا ہوا تھا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر اٹھا۔ کسی نے اس سے بات نہیں کی۔ دن بھر رات کی طرح گھسٹتے ہوئے گزرا پھر شام کے وقت اسی کا باپ اس کے پاس آیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بوسہ دیا۔ ''تم قاہرہ جاؤ گے۔'' اس نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ ایک نوکر بھیجو گا۔'' اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے وہ صرف اتنا ہی کر سکا اور اس کی ماں بھی جذبات سے تقریباً بے قابو تھی۔

رخصت کا دن آیا اور وہ خاندان کے ایک اور لڑکے کے ساتھ گاڑی میں سوار ہونے کو چلا ملازم کے گھر والوں نے کہا کہ وہ اسے سٹیشن پر ملیں گے لیکن لڑکا گاڑی کے

MashalBooks.org

آنے تک اس کا انتظار کرتا رہا اور ملازم نہیں آیا۔ چنانچہ دوسرے گاڑی میں سوار ہو کر چلے گئے اور اپنے بھائی کو وہیں چھوڑ گئے نوجوان اور اس کا باپ اداس اور خاموش گھر کی طرف واپس ہو گئے۔

اسی شام ملازم آ گیا اور وہ پھر سے ہشاش بشاش ہو گیا۔ دو روز بعد وہ اپنے سیاہ فام ملازم کے ساتھ جو اس کے بھائی کے لئے چیزیں اٹھائے ہوئے تھا۔ قاہرہ روانہ ہو گیا۔

اس طرح وہ قاہرہ لوٹ آیا اور اپنے حبشی ملازم کے ساتھ وہاں مقیم ہو گیا جو اسے اظہر میں لیکچرز کے لئے لے جاتا اس کا کھانا تیار کرتا اور جب فارغ ہوتا تو اپنی لڑکھڑاتی ہوئی ٹوٹی پھوٹی آواز میں اسے پڑھ کر بھی سناتا۔

اسی دوران مصری یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور ہمارے دوست نے اس میں داخلہ لے لیا۔ اس کا حبشی ملازم صبح کو لیکچرز کے لئے اسے اظہر لے جاتا، اسے زندگی میں ایک نیا لطف آیا۔ نئے قسم کے لوگوں سے ملاقات ہوئی اور ان اساتذہ سے تعلیم حاصل جو اظہر سے مختلف قسم کی جماعتوں کو پڑھا رہے تھے یونیورسٹی اس کی رہائش سے بہت دور تھی اور مدرسہ قضا اور دارالعلوم بھی اتنے ہی فاصلہ پر تھے۔ اب وہاں ٹھہرنے میں کوئی تک نہیں تھی اور یہ چھوٹا سا گروہ درب الجمامیز کے ایک نئے گھر میں منتقل ہو گیا۔

یوں نوجوان نے ایک نئی زندگی کی ابتدا کی جس کا پرانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہفتہ میں ایک دو بار شاید اسے اظہر چھوڑنے کا افسوس ہوتا اور یونیورسٹی آتے جاتے اظہری دوستوں سے اس کی ملاقات ہوتی رہتی اور کبھی کبھی وہ شیخ مرصفی سے ملاقات کے لئے جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں نوجوان اظہر سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا تھا لیکن اس کا نام وہاں درج رہا۔ اس نے اپنے باپ کو بھی اپنے اس حتمی فیصلہ کی اطلاع نہیں دی اس ڈر سے کہیں وہ مایوس نہ ہو اور اس کا دل نہ دکھے اس کے باپ کو یونیورسٹی کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا اور اس کے لئے اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران ایک روز جب نوجوان اور اس کا بھائی اپنے نئے گھر میں واپس آ گئے تھے اور جس وقت وہ پڑھائی میں مصروف تھے ڈاک آئی اور اس

کے بھائی کے ایک دوست کا خط ملا۔ اس نے اسے پڑھا پھر اسے اپنے بھائی کو سنایا۔ اس میں ایک بڑی زبردست خبر تھی۔

لڑکا آٹھ برس سے اظہر میں زیر تعلیم تھا جس دوران وہاں کے قواعد کئی مرتبہ بدلے۔ اس موسم گرما میں داخل شدہ تمام طلباء کو یہ رعایت دی گئی تھی اگر وہ یہ ثابت کرسکیں کہ وہ اظہر یا کسی اور دینی ادارے میں پندرہ برس سے کم عمر میں جو داخلہ کے لئے کم از کم عمر تھی۔ زیر تعلیم رہے ہیں تو انہیں داخلہ کی مدت بڑھانے کی اجازت تھی۔ اس کے نتیجہ میں ان کے امتحان اور سند حاصل کرنے کی تاریخ وقت سے پہلے آ جاتی۔

اس نئے قانون کا اعلان چھٹیوں کے دوران ہوا تھا اور ان کے دوست نے فوراً ہی ایکڑ کو درخواست دے دی تھی کہ اس نے مطلوبہ عمر تک پہنچنے سے پہلے دو سال تک اظہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے یہ درخواست دو سینئر شیخ صاحبان کو دکھائی جن سے نہ وہ کبھی پڑھا تھا نہ کسی طرح کی واقفیت تھی۔ تاہم انہوں نے یہ درخواست پڑھی اور اسکی تصدیق کر دی۔ ان کو اس پر الزام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے پاس سینکڑوں طالب علم آتے تھے وہ سب کو کیسے پہچان سکتے تھے۔

یوں لڑکے کو معلوم ہوا اور اس سے اسے بڑی حیرانی ہوئی کہ اسے اظہر میں دس سال زیر تعلیم رہنے کا پروانہ مل گیا جب کہ وہ وہاں صرف آٹھ برس رہا تھا اور یہ کہ مزید دو سال کے بعد وہ سند کے لئے امتحان دینے کا اہل ہو جائے گا۔

چنانچہ اسے پھر اظہر سے رابطہ قائم کرنا پڑا جو اس نے توڑ دیا تھا یا توڑنے کی کوشش کی تھی اور دونوں جگہ اپنے قدم جمائے ہوئے تھے یعنی جامعہ اظہر میں بھی۔ جو اس کا اس وقت نام تھا اور مصری یونیورسٹی میں بھی وہ یہ دوہری زندگی گزارے جا رہا تھا۔ ''دنیاؤں کے درمیان جو اسے مختلف سمتوں میں کھینچتی تھیں اظہر کی پرانی دنیا، باطنیہ اور کفر الطماعین کے درمیان پرانی بوسیدہ گلیاں اور شارع کوبری قصر النیل کی جدید شان و شوکت کے درمیان یونیورسٹی کی نئی دنیا۔

یہاں ہم اس سے رخصت ہوتے ہیں جب کہ نئی اور پرانی دنیائیں اس پر تسلط حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے الجھ رہی ہیں کون جانے؟ شاید ایک دن ہم یہ کہانی پھر شروع کرسکیں۔

اپنے بیٹے کے نام

اور اب تم بھی ۔ میرے فرزند ۔ اس چھوٹی سی عمر میں ۔ اپنا گھر چھوڑ کر ۔ وطن چھوڑ کر ۔ ملک چھوڑ کر ۔ عزیزوں اور دوستوں سے رخصت ہو کر سمندر پار تعلیم حاصل کرنے کے لئے پیرس جا رہے ہو۔

میں تمہیں یہ کہانی نذر کرتا ہوں ۔ وقتاً فوقتاً جب تم پڑھائی سے اکتا جاؤ ۔ لاطینی اور یونانی سے تنگ آ جاؤ ۔ یہ شاید تمہیں کچھ سکون دے کچھ آرام دے ۔ ان صفحات میں تمہیں مصری زندگی کا ایک ایسا رخ نظر آئے گا جو کبھی تمہارے علم میں نہیں تھا اور تمہیں کسی کی یاد دلائے گا جسے کئی بار تمہاری موجودگی نے سہارا دیا اور جو تمہاری خوشی میں اتنی ہی طمانیت حاصل کرتا تھا جتنی تمہاری سنجیدگی میں ۔ ایک بے مثال طمانیت ۔

جولائی اگست ۔۱۹۹۳ء